یادگارِ حالؔی

(تذکرہ خواجہ الطاف حسین حالؔی)

صالحہ عابد حسین

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
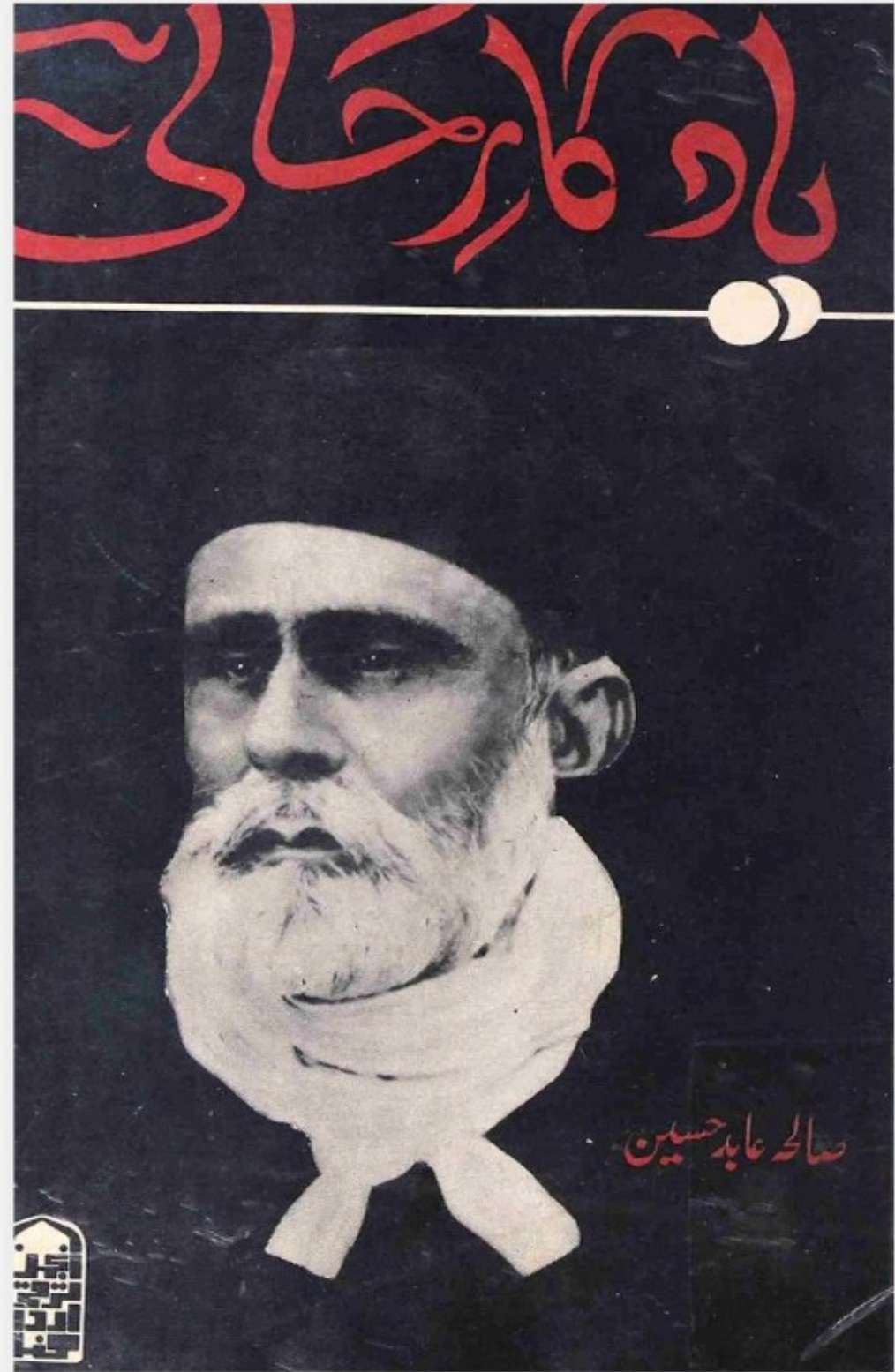
سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۵۱۹

سنہ اشاعت: ۱۹۸۶ء

قیمت: ۳۰/۰۰ روپے، ڈی لکس ایڈیشن: ۴۰/۰۰ روپے

طباعت: سمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

زیراہتمام: انیس احمد

ٹائیٹل ڈیزائن: عبدالباری ثاقب

کتابت: عبدالکریم

اڈیشن: پانچواں

پتے

انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، راؤز ایونیو،
نئی دہلی

انجمن ترقی اردو بک ڈپو،
سلطان جہاں منزل
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ (یو۔پی)

فہرست

نذرِ عقیدت

برادرِ محترم ذاکر صاحب کی خدمت میں، جنھوں نے تعلیم میں اُن اعلیٰ قدروں کی روح پھونکی جن سے حالؔی نے اُدب کو روشناس کیا تھا۔

تمہید

یادگارِ حالؔی لکھتے وقت باوجود تلاش کے مجھے کئی ایسی کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں جن کی بہت ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ مولانا حالؔی کے ذاتی حالات جاننے والے یا تو خدا کو پیارے ہو چکے ہیں اور باقی زمانے کی گردش اور دیس کے بٹوارے کے ہاتھوں اپنے وطن سے بے وطن ہو کر ہندوستان اور پاکستان میں اس طرح بکھر گئے ہیں کہ اُن کی پھر شیرازہ بندی ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔ میں نے اکثر ایسے بزرگوں کو جو مولانا حالؔی کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، جن میں ان کے عزیز، شاگرد اور نیازمند شامل تھے، خط لکھے کہ وہ حالؔی کی سوانح حیات لکھنے میں میری مدد کریں لیکن ان میں سے اکثر نے تو میرے خطوں کا جواب دینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں فرمائی۔ دو ایک نے جواب دیا، ہمت افزائی بھی کی لیکن کوئی مدد نہ دے سکے یا دینی نہ چاہی۔ بہر حال جتنے حالات اور واقعات میں کتابوں سے، عزیزوں سے اور خود اپنی یادداشت سے فراہم کر سکتی تھی اُن کی بنا پر دو ڈھائی سال کی مسلسل محنت کے بعد، میں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ یہ کتاب دراصل کسی بڑے ادیب کو لکھنی چاہیے تھی۔ میں چاہوں تو ایسے کئی بزرگوں کے نام بتا سکتی ہوں جو اس کام کو مجھ سے بہت بہتر کر سکتے ہیں اور جن پر اردو زبان اور ادب کا اتنا حق ضرور ہے کہ وہ اس کے ایک رنگین رکین کی زندگی اور ادبی کارناموں پر ایک مفصل اور معقول کتاب لکھیں۔ لیکن چونکہ انھوں نے اس کام کو نہیں کیا، اس

لیے میں نے فرضِ کفایہ کے طور پر اس کو اپنے ذمّے لیا۔ اس خدمت کا سب سے بڑا محرک میری وہ پُرخلوص عقیدت ہے جو مجھے حالیؔ سے ہے اور جو شاید (نقّادوں کی نظر میں تو نہیں لیکن عام پڑھنے والوں کی نظر میں) ایک حد تک اس کی دوسری کوتاہیوں کی تلافی کر سکے۔ اس عقیدت کا سبب یہ نہیں کہ وہ میرے بزرگ تھے۔ اس زمانے میں بعض لوگ اپنے نامور بزرگوں کے نام اور کارناموں پر مجاور بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر حالیؔ نے کبھی ادبی مجاوری کو پسند نہیں کیا، کوئی اپنا خاص ''اسکول'' یا حلقہ قائم نہیں کیا۔ ذاتی پراپاگنڈے کو ہمیشہ شبہے اور حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اس لیے میری عقیدت اُن کے ساتھ خاندانی رشتے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس عظیم الشان خدمت کی وجہ سے ہے جو انھوں نے اردو ادب، اردو شاعری اور اردو زبان کی انجام دی۔ انھوں نے اردو ادب کو بعض نئی جہتوں اور حیات بخش تحریکوں سے آشنا کیا اور اگر انیسویں صدی میں حالیؔ کا قدم ادب کی سرزمین میں نہ پڑا ہوتا تو شاید آج اس کا مرقع بعض لحاظ سے بہت مختلف ہوتا۔ دوسرا سبب میری عقیدت کا حالیؔ کی لاثانی سیرت ہے۔ حالیؔ انسان کی حیثیت سے ایک ولی صفت شخص تھے اور اس بارے میں مجھے اپنے بزرگوں اور مولانا حالیؔ کے دوستوں اور نیازمندوں وغیرہ سے جو باتیں معلوم ہوئیں اُن کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اُن کی ذات میں ان اعلیٰ قدروں کا جلوہ نظر آتا ہے جن پر انسانی فضیلت کا انحصار ہے۔ عقیدت کے یہ دونوں سرچشمے میری نظر میں ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں بلکہ اُن کا گہرا تعلق ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ایک گھٹیا قسم کا انسان اچھا ادیب یا شاعر نہیں ہو سکتا (ادب کی تاریخ اس دعوے کے خلاف ہے) لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ ادب اور شاعری میں بہت زیادہ اثر اور خلوص اور زندگی بخشنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اگر ادیب اور شاعر کی زندگی اور کلام و تصنیف میں ہم آہنگی پائی جائے، اگر حسن آئینۂ حق ہو اور دل آئینۂ حسن اور حالیؔ کا قلبِ صافی حُسن و صداقت و شرافت کا آئینہ دار تھا۔ اس لیے گو میں نے تنقید کے معاملے میں حتیٰ الامکان غیر جانب داری سے کام لینے کی کوشش کی ہے اور جو ادبی پہلو مجھے کمزور نظر آئے اُن کی طرف اشارہ کر دیا ہے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ (بعض ماہرین تنقید کی طرح) میں نے تنقید کو فردِ قرار دادِ جرم بنا دیا ہے۔

میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں جنھوں نے اپنی شفقتِ بزرگانہ سے کام لے کر اپنی مصروفیات کے باوجود، اِس مسودے کو اوّل سے آخر تک پڑھا، اور نہ صرف کتاب کے لیے مقدمہ عطا فرمایا بلکہ مولانا حالیؔ کے بارے میں خاص طور پر چند دلچسپ اور سبق آموز واقعات لکھ کر اپنے بیان اور قلم کی برکت سے اسے چار چاند لگا دیے (ویسے بھی میں جب کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں آپ نے ہمیشہ حالیؔ کی سیرت اور صفات پر روشنی ڈالی اور اُن کے بارے میں اپنی بیش بہا رائے اور خیالات سے آگاہ فرمایا ہے)۔ اُن کا مقدمہ اور بیش بہا عطیہ دونوں اصل تصنیف سے پہلے زینتِ کتاب ہیں۔

بہر حال کتاب جیسی کچھ ہے ناظرین کی نذر ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو مجھے خوشی ہوگی کہ اس کی بدولت آپ کو حالیؔ کی شخصیت اور کلام سے دلچسپی ہوئی۔ اگر آپ پسند نہ کریں تو دعا کیجیے کہ حالیؔ کا کوئی اور قدردان ایک بہتر کتاب لکھ کر اس فرض کو ادا کرے۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی۔

صالحہ خاتون

۱۹ر ستمبر ۱۹۴۹ء — جامعہ نگر۔ دہلی

پیش لفظ

خواجہ الطاف حسین حالؔی مرحوم کے حالاتِ زندگی پر اس وقت تک کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی ہے جو قابلِ ذکر ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ خود انھیں کے خاندان کی ایک رکن عزیزی بیگم صالحہ عابد حسین کو اس کام کی ضرورت کا احساس ہوا، اور انھوں نے وہ تمام حالات جو خاندانی وسائل سے معلوم ہو سکتے تھے، خوش اسلوبی کے ساتھ ایک رسالے میں جمع کر دیے بلاشبہ یہ خواجہ صاحب کی مطلوبہ سوانح عمری نہیں ہے لیکن مطلوبہ سوانح عمری کا ایک ایسا قیمتی مواد ہے، جس سے زیادہ مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا تھا اور جو اگر قیدِ کتابت میں نہ آجاتا تو ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جاتا۔ بیگم صالحہ عابد حسین خواجہ صاحب مرحوم کی نواسی ہیں۔ انھیں بچپن سے موقع ملا تھا کہ گھر کے چھوٹے بڑوں سے اپنے جدِّ بزرگوار کی زندگی کا ایک ایک واقعہ سنیں، اور اُسے اپنی خاندانی زندگی کا ایک قیمتی ورثہ سمجھ کر محفوظ رکھیں۔ ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی کے لیے اس سے زیادہ مستند ذریعۂ علم اور کیا ہو سکتا تھا؟ ہمیں بیگم صالحہ عابد حسین کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے یہ خاندانی امانت قلم و قرطاس کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی۔

ابوالکلام آزاد

دہلی ۸ ستمبر ۱۹۴۹ء

دیباچہ طبعِ ثانی

یادگارِ حالی کا جو ۱۹۵۰ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی، دوسرا ایڈیشن آپ کے سامنے ہے۔ پانچ سال کے عرصے میں کسی ایسی اردو کتاب کا، جو نہ گھٹیا قسم کا ناول ہے نہ کسی مشہور ادیب کا شہپارہ، پورا ایڈیشن نکل جانا بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔

یادگارِ حالی کا، حالؔی کے معتقدوں اور پرستاروں، اردو کے ادیبوں اور نقادوں نے جس طرح خیر مقدم کیا وہ میری امید اور استحقاق سے بہت زیادہ ہے۔ یہ کتاب اس وقت ہندوستان کی چار یا پانچ یونیورسٹیوں کے کورس میں شامل ہے۔ بہت سے بزرگوں نے اِسے جس انداز سے سراہا ہے وہ میرے لیے دلی مسرت اور فخر کا باعث ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں کہ اس کتاب کی مقبولیت میں مصنّفہ کا کمال یا خوبی نہیں بلکہ حالؔی کی عظیم شخصیت، بلند سیرت اور ان کے ادبی و شعری کارناموں کا حصّہ ہے جس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ اسی لیے اردو کے اس محبوب شاعر اور ادیب کی سوانح حیات جیسی کچھ بھی ہے، جب حالؔی کے قدر دانوں کے سامنے آئی تو اُنھوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی قدر اور مصنّفہ کی ہمت افزائی کی۔

اس ایڈیشن میں آپ دیکھیں گے کہ صرف کتاب پر نظرِ ثانی ہی نہیں کی گئی بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ بھی ہوا ہے۔ بعض باتیں جو اُس وقت مصنّفہ کے علم میں نہ تھیں بڑھائی ہیں۔ بعض خیالات جو اس وقت زیادہ واضح نہ تھے ان پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور بعض چیزیں جو اس

وقت نظر سے چوک گئی تھیں اب دے دی گئی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حالی کی
وہ جامع اور مانع سوانح حیات ہے جس کے اردو کے پرستار مدت سے منتظر ہیں۔ اس میں اب
بھی بہت سے ایسے گوشے ہیں جو تشنہ ہیں۔ بہت سے عنوان اور موضوع ایسے ہیں جن پر اور زیادہ
تفصیل سے بحث کی جا سکتی تھی۔ اُن کی تصنیف و تالیف پر مفصل نقد و تبصرے کے لیے جس علمی
لیاقت اور تنقیدی نظر کی ضرورت ہے، ظاہر ہے کہ میں اپنی کم علمی کے سبب اُس کا حق نہیں ادا کر
سکی ہوں۔ ان کے عربی اور فارسی کے کلام اور تحریروں پر لکھنے کا بھی میں نے اپنے کو مجاز نہیں سمجھا۔
اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں ہوں گی جن پر اپنی لاعلمی یا کم علمی کے باعث یا وسائل کی کمی اور
حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے میں زیادہ بحث نہیں کر سکی۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ اردو کا کوئی
اچھا اور بڑا ادیب میری اس کوتاہی کی تلافی کرے گا۔ ساتھ ہی میرا یہ نیک ارادہ بھی ہے کہ میں آئندہ
بھی حالی کے متعلق تحقیق اور مطالعہ جاری رکھوں گی۔ دوسرا ایڈیشن شاید پہلے سے کچھ بہتر حالت میں
آپ کی خدمت میں آ رہا ہے۔ ممکن ہے تیسرا دوسرے سے بہتر پیش کر سکوں۔

صالحہ خاتون

جامعہ نگر

۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء

دیباچہ

(طبع پنجم)

یادگارِ حالی کا یہ اڈیشن آپ کے ہاتھ میں آ رہا ہے عرصہ دراز پہلے جب میں نے یہ
کتاب لکھی تھی تو مجھے خیال بھی نہ تھا کہ یہ اتنی مقبول اور پسندیدہ ثابت ہوگی۔
میری اس ناچیز کوشش کی پذیرائی ہوئی۔ سخت سے سخت نقادِ فن نے اس کی افادیت کا اعتراف کیا،
متعدد یونیورسٹیوں میں اس کو کورس میں یا کورس سے باہر مطالعہ کے لیے رکھا گیا اور اس کے
بارے میں آج تک میرے پاس پڑھنے والوں کے جو خطوط آتے ہیں۔ ان سب نے مل کر ہونا تو یہ چاہیے
تھا کہ مجھ میں غرور اور خود پسندی پیدا کر دی ہوتی مگر خدا کا شکر ہے کہ حالی کی یہ ذرا سی صفت
میرے حصے میں آئی ہے کہ کام خود اس کا انعام ہے اور بہتر سے بہتر کی کوشش فن کار کا فرض ہے۔
میں نے اس کے پچھلے اڈیشن میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا تھا۔ موجودہ اڈیشن میں بھی
بہت کچھ اضافہ کرنے کی خواہش تھی مگر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہ کام نہ ہو سکا اور اس کی اشاعت
میں بھی دیر ہو گئی۔ بہرصورت اس نئے اڈیشن کے لیے میں نے ضمیمہ کے طور پر "غالب، حالی کی
دریافت" اپنا ایک مقالہ شامل کیا ہے۔ جس سے ان اشاروں پر جو کتاب کے اندر ہیں بہت زیادہ
روشنی پڑتی ہے۔

میں شکر گزار ہوں اپنے خالق کی کہ اس نے میری سعی مشکور کی۔ میں خوش ہوں کہ اس کتاب کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے کئی ادیبوں، تحقیق کرنے والوں اور مضامین لکھنے والوں کے دل میں حالیؔ کے بارے میں سوچنے اس پر لکھنے اسے سمجھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں سب سے زیادہ شکر گزار ہوں اپنے ان نوجوان پڑھنے والوں کی جنھوں نے اس کتاب کو پڑھا۔ اور غالباً کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ یہ فیض حالیؔ کا ہے۔ یہ سیرت اور شخصیت حالیؔ کی ہے جو دبانے پر بھی ابھرآتی ہے۔ جو چمک دمک اور طمطراق نہ ہونے کے باوجود اپنے کو منواتی ہے۔ اس کا ایک واضح ثبوت حال میں (دسمبر ۱۹۸۵ء) حالی کے وطن پانی پت میں شاندار جشنِ حالیؔ بھی ہے جس کا افتتاح جناب گیانی ذیل سنگھ صدرِ جمہوریہ ہند نے کیا جس کا اہتمام گورنر ہریانہ جناب مظفر برنی کی بدولت ہوا۔ اور اس تین دن کے جشن میں ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی، وزیرِ اعلیٰ ہریانہ وزیرِ تعلیم اور عام بڑے بڑے ایجوکیشن کے افسروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے ملازموں اور کارکنوں تک نے نہایت خلوص اور محنت سے اس جشنِ حالیؔ کو کامیاب بنایا۔ اسی موقع پر ہریانہ میں اردو اکیڈمی کے قیام کا بھی اعلان ہوا جس کا نام حالیؔ اردو اکیڈمی ہریانہ تجویز ہوا۔ اسی پانی پت میں جہاں اب حضرت بو علی شاہ قلندرؒ اور ان کے پاس خواجہ الطاف حسین حالیؔ کا مزار موجود ہے۔ یہ جشن، بہار کا ایک جھونکا تھا اردو کے بچوں کے لیے اردو کے خادموں کے لیے۔ اردو کے لیے۔ اس جشن میں شرکت کے لیے دور دور کے شہروں سے کئی لوگ آئے، حالیؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مقالے پڑھے صدارتی تقریریں ہوئیں۔ نظمیں پڑھی گئیں اور ثبوت ملا کہ ابھی ہم زندہ ہیں، ہماری تہذیب اور زبان زندہ ہے۔ ہماری اردو زندہ ہے جس کا ایک حیاتِ جاوید پانے والا خادم حالیؔ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

میں سچ مچ اپنے پڑھنے والوں اور حالیؔ کے قدردانوں کی اور ساتھ ہی انجمن ترقی اردو (ہند) کی شکر گزار ہوں کہ اس نے یادگارِ حالیؔ کو جو ایک عرصے سے ناپید تھی نیا اڈیشن شائع کر کے شائقین کے ہاتھوں تک پہنچایا اور مجھے ممنون کیا۔

صالحہ عابد حسین

۵ مارچ ۱۹۸۶ء

عطیۂ مولانا ابوالکلام آزاد

خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے دہلی کے ایک مشاعرے کا حال مجھے سنایا تھا، جس میں خواجہ حالیؔ مرحوم اور داغؔ مرحوم دونوں شریک ہوئے تھے۔ طرح تھی "خبر کہاں، نظر کہاں"، داغؔ مرحوم کی غزل مشہور ہے:

اس مبتدا کی دیکھیے نکلی خبر کہاں

مشاعرے میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داغؔ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور انھوں نے اپنی غزل سنائی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب — آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں؟

اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے، غزل تمام مشاعرے پر چھا گئی اور مدح و تحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا، اب داغؔ مرحوم کے لیے کچھ نہیں رہا ہے۔ خود داغؔ نے کہا "اس غزل کے سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گر گئی، جی چاہتا ہے اسے چاک کر دوں۔"

ایک عرصے کے بعد خواجہ صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے غدر کے بعد کے مشاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور خصوصیت کے ساتھ اس مشاعرے کا حال دریافت کیا۔ خواجہ صاحب حالات

بیان کرنے لگے اور تفصیلات کی رو میں دور تک نکل گئے۔ لیکن پھر اچانک انھیں احساس ہوا کہ اب مجھے غزل کی مدح وتحسین کے واقعات بیان کرنے پڑیں گے، اس لیے کہتے کہتے یک قلم رک گئے۔ اَب میں ہر چند اصرار کر کے پوچھتا ہوں، فرمایئے، اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ "جی ہاں، بس غزل پڑھی گئی اور مشاعرہ ختم ہوگیا۔" میں نے بار بار پوچھا، آپ کی غزل پر داغؔ مرحوم نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟ لیکن "جی ہاں، کیا کہا جائے۔" کے سوا اور کوئی جواب نہیں ملا "جی ہاں"، کی "ہاں"، کو وہ جس طرح تمدید کے ساتھ ادا کرتے تھے اُسے قیدِ کتابت میں لانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں پاتا کہ "جی ہاں" کی "ہاں" پر ایک لمبی مد کھینچ دوں۔

۱۸۹۲ء میں سرسیّد مرحوم ایک وفد حیدر آباد لے گئے تھے تاکہ علیگڑھ کالج کے لیے مزید اعانت کی درخواست کریں۔ وفد میں خواجہ صاحب اور مولانا شبلؔی مرحوم بھی تھے۔ وہاں لوگوں کو خیال ہوا کہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر ایک مشاعرہ منعقد کرنا چاہیے۔ چنانچہ مشاعرہ قرار پایا اور یہ تجویز ہوئی کہ کسی خاص طرح کی پابندی نہ رکھی جائے۔ ہر شخص اپنا منتخب اور تازہ کلام سنائے۔ داغؔ مرحوم نے اپنی وہ غزل سنائی تھی جو اُن کے تیسرے دیوان مہتاب داغ میں ہے۔

ادھر لا ہاتھ، مٹھی کھول، یہ چوری یہیں نکلی

داغؔ کی زبان، منتخب غزل، اور پھر ان کے پڑھنے کا ہنگامہ خیز انداز، سارا مشاعرہ بیخود ہو گیا اور تعریف کرتے کرتے لوگوں کے گلے پھٹ گئے۔ اس کے بعد شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی۔ مولانا شبلؔی مرحوم کہتے تھے کہ میں پہلو میں بیٹھا تھا میں نے مجلس کا رنگ دیکھا تو خیال کیا کہ یہاں نئی شاعری کا رنگ جم نہیں سکتا اگر خواجہ صاحب نے اس طرح کی کوئی چیز سنائی تو یقیناً بے مزہ اور پھیکی محسوس ہوگی اور لوگ بے کیف ہوجائیں گے۔ میں نے ان کے کان میں کہا، آپ اپنے قدیم کلام میں سے کوئی چیز سنائیں۔ نئی شاعری کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا اور کہا جو کچھ ہو مگر "از قاعدہ نہ باید گزشت۔"

یہ حکیم علوی خاں کا مشہور لطیفہ ہے جو محمد شاہ کا شاہی طبیب تھا۔ یعنی مریض بچے یا نہ بچے مگر علاج قواعد فن کے مطابق کرنا چاہیے۔ خواجہ صاحب کا مطلب یہ تھا کہ مشاعرے میں رنگ جمے یا نہ جمے مگر اپنا اصول نہیں چھوڑنا چاہیے۔

چنانچہ انھوں نے اپنی نئی قسم کی غزلوں میں سے وہ غزل پڑھی جو دیوان میں موجود ہے۔ "کمال تیرا"۔ "جمال تیرا"۔

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا

مولانا شبلؔی مرحوم کہتے تھے کہ باوجود اس کے کہ ابھی ابھی داغؔ کی شوخ عاشقانہ غزل تمام مجلس میں تہلکہ مچا چکی تھی مگر ایسا معلوم ہوا جیسے جوشِ مدح وتحسین کی ایک نئی سرگرمی لوگوں میں ابھر آئی ہو۔ ہر شعر کی تعریف کی گئی۔ داغؔ مرحوم نے کہا "مولانا! یہ آپ ہی کا حصّہ ہے اس رنگ میں آپ کا کوئی سہیم نہیں۔"

خواجہ صاحب مرحوم کی ایک غزل ہے ؎:

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

مقطع ہے ؎:

ان کو حالؔی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں!
دیکھنا آپ کی، اور آپ کے گھر کی صورت

علیگڑھ کالج کا ایک طالب علم داؤد نامی تھا۔ شاعری سے اُسے طبعی مناسبت تھی۔ اس نے اس غزل کی تضمین کی اور مقطعے کی تضمین کچھ ایسی چسپاں واقع ہوئی، گویا مقطع حالؔی کا نہیں رہا، داؤد کا ہوگیا:

جب کسی کام کا کرتا ہے ارادہ انساں   دیکھ لیتا ہے کہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سن کے لوگوں سے کہ کل آئے تھے داؤدؔ کے یاں   اُن کو حالؔی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

چند دنوں کے بعد خواجہ صاحب علیگڑھ آئے۔ چونکہ مقطعے کی تضمین میں شوخیِ طبع سے کام لیا

تھا اور ایک طرح کا گستاخانہ پہلو تھا، اس لیے داؤد نے اپنے دوستوں کو تاکید کر دی تھی کہ اس تضمین کا ذکر خواجہ صاحب سے نہ کریں، لیکن کسی شخص نے کر دیا۔ خواجہ صاحب کو جونہی یہ بات معلوم ہوئی، نہایت درجہ خوش ہوئے۔ اصرار کر کے داؤد کو بلوایا اور مجبور کیا کہ پوری تضمین سنائے۔ پھر تعریف کر کے اس کا دل بڑھایا، اور "دیوانِ حالی" درجہ اوّل کا چھپا ہوا بطور صلے کے عطا فرمایا اور کہا یہی ایک نسخہ ہے جو میں نے اپنے لیے رکھا تھا لیکن اب میں اس کا مستحق اپنے سے زیادہ تمھیں سمجھتا ہوں۔

افسوس ہے، اس طالب علم کا جوانی میں انتقال ہو گیا۔

ایک سنجیدہ آدمی کوئی معمولی سی بات بھی ظرافت کی کہہ دیتا ہے تو وہ غیر معمولی تاثر اور کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم سرتاپا سنجیدہ تھے لیکن اس سنجیدگی کے ساتھ طبیعت میں ظرافت بھی تھی۔ اور نہایت لطیف پیرائے میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی مرحوم نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم اگرچہ علیگڑھ کے قیام کے بعد سرسید مرحوم کے خیالات سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور دراصل تصنیف و تالیف اور فکر و نظر کا نیا مذاق اسی تاثر سے ان میں پیدا ہوا، تاہم وہ مذہبی خیالات میں اپنے آپ کو سرسید مرحوم کے مقلدوں سے الگ رکھتے تھے اور جب کبھی کوئی موقع نکل آتا بلا تامل اُس کا اظہار کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں سرسید کو نیچر نیچر کہا جاتا تھا اور اُن کے مقلدوں کو نیچری۔ بنیاد اس تلقب کی یہ تھی کہ انھوں نے اپنی تحریرات میں جا بجا نیچر اور لاز آف نیچر یعنی فطرت اور قوانینِ فطرت کا ذکر کیا تھا، اور اس پر زور دیا تھا کہ دینی تعلیم کو قوانینِ فطرت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔

جس زمانے میں سرسید مرحوم سورۂ اسریٰ کی تفسیر لکھ رہے تھے تو اکثر واقعۂ اسریٰ یعنی معراج کا تذکرہ رہتا تھا۔ معراج کے متعلق حضرت عائشہ کا مذہب معلوم ہے کہ وہ معراجِ جسمانی کی قائل نہ تھیں۔ سرسید نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔ اور معراجِ جسمانی کی روایات جمع کر کے اُن کی ہر طرح تضعیف کی۔ ایک دن سرسید کے یہاں خواجہ صاحب مرحوم بھی تھے اور مولانا شبلی بھی۔

حضرتِ عائشہ کے مذہب کا تذکرہ ہونے لگا۔ مولانا شبلی ازراہِ ظرافت بول اٹھے کہ معلوم ہوتا ہے، حضرتِ عائشہ بھی نیچری تھیں۔ ورنہ معراجِ جسمانی سے کیوں انکار کرتیں؟ یہ سنتے ہی خواجہ صاحب نے کہا "اس سے ثابت ہوا کہ نیچری ہونا بڑی ہی فضیلت کی بات ہے کہ حضرت عائشہ تک اس جرگے میں داخل ہیں۔ لیکن مولانا! کل تو آپ بڑے اصرار سے کہہ رہے تھے کہ میں نیچری نہیں ہوں۔ اچھا، اب معلوم ہوا یہ آپ کا انکسار تھا"

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو

خواجہ صاحب کی علمی خدمات کے سلسلے میں ایک کتاب کا ذکر رہ گیا ہے یعنی حکیم ناصر خسرو کے سفرنامے کی تصحیح اور اشاعت۔

حیات سعدی کا پہلا ایڈیشن جو دہلی میں چھپا تھا، میرے کتب خانے میں ہوگا مجھے یاد ہے کہ اس کے ٹائیٹل پیج پر اس سفرنامے کا اشتہار چھپا تھا اس سے معلوم ہوا، کہ "حیاتِ سعدی" سے پہلے یہ کتاب چھپ چکی تھی۔

ابوالکلام آزاد

نشوونما

پانی پت کے محلہ انصار میں ایک بزرگ خواجہ ایزد بخش انصاری رہتے تھے۔ اُن کے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تو پہلے ہی سے تھیں ۱۸۳۷ء – ۱۲۵۳ھ میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام الطاف حسین رکھا گیا۔ اسی لڑکے کو آج دنیا حالؔی کے نام سے جانتی ہے۔

اُن کی والدہ سیّدانی تھیں اور والد کا شجرۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ اُن کے بزرگوں میں بڑے بڑے عالم دین، صوفی اور ادیب و خطیب گزرے ہیں۔ میر علی شاہ ہرات کا فرماں روا اور بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے بیٹے خواجہ ملک علی کسی وجہ سے دولت و حکومت چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں غیاث الدین بلبن نے اُن کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں پانی پت میں زمین و جائداد دی۔ اور ۱۲۷۶ء میں وہ اس قصبے میں آباد ہوئے۔ جن کے نام کو اُن کی اولاد میں سے ایک شخص الطاف حسین حالؔی نے چار چاند لگائے۔ چنانچہ پانی پت حالؔی کے بزرگوں کا سات آٹھ سو سال سے وطن تھا اور یہیں اُن کی پرورش اور تربیت ہوئی۔

نو برس کی چھوٹی سی عمر میں الطاف حسین کو یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ قدرت جس شخص سے دنیا میں کوئی بہت بڑا کام لینا چاہتی ہے اُسے اکثر بچپن ہی میں ماں یا باپ کی آغوشِ شفقت سے جدا کر دیتی ہے۔ شاید اس لیے کہ جو بچے بچپن سے مصیبت اور صدمے اٹھائے ہوتے ہیں اکثر ان کے

دل دوسروں سے زیادہ نرم اور گداز ، حسّاس اور درد مند اور اُسی کے ساتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ باپ کے انتقال سے پہلے ہی الطاف حسین ماں کی تربیت سے محروم ہو چکے تھے۔ اُن کی والدہ کے دماغ میں کچھ خلل سا آ گیا تھا اور اس لیے وہ عرصے سے دنیا کے معاملات سے بیگانہ اور عام طور پر بالکل خاموش رہا کرتی تھیں۔ ماں کے دماغ کی خرابی اور باپ کی بے وقت موت سے الطاف حسین کے ننھے سے دل پر جو چوٹ لگی اُس کی بہت کچھ تلافی بھائی بہنوں کی محبت نے کر دی۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے چھوٹے بھائی کو اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا، اور بہنوں نے بھی اس دُرِ یتیم کی پرورش میں اپنی جان لڑا دی۔

پرانے زمانے کے دستور کے موافق ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللّٰہ ہوئی۔ پانی پت کا ایک پرانا دستور یہ تھا کہ وہاں ہر مسلمان بچہ قرآن شریف کا ایک حصہ ضرور حفظ کرتا تھا اور وہاں کی قرأت سارے ملک میں مشہور تھی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جیّد قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ اُن کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ وہ چھٹپنے سے قرآن شریف اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے کہ بڑے بڑے قاری اور عالِم تعریف کرتے تھے۔ اُن کا اپنا بیان یہ ہے کہ اس کے بعد سے پھر کبھی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن طبیعت کو علم سے فطری طور پر لگاؤ تھا اس لیے یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ حفظِ قرآن کے بعد فارسی کی تھوڑی تعلیم سید جعفر علی سے حاصل کی جو فارسی کے بہت اچھے ادیب اور سخن فہم سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے فیضِ صحبت سے الطاف حسین کو اُسی وقت سے نہ صرف فارسی زبان اور ادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی بلکہ اُن کی طبیعت میں شاعری کا جو فطری مادّہ تھا اُسے بھی جِلا ملی۔

فارسی کے ساتھ ساتھ انھیں عربی کا بھی شوق پیدا ہوا۔ پانی پت کے ایک نوجوان حاجی ابراہیم حسین صاحب اُسی زمانے میں تحصیلِ علم کے بعد مجتہد بن کر واپس آئے تھے۔ الطاف حسین نے اُن سے عربی سیکھنی شروع کی اور صرف و نحو کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ اپنی تعلیم کو تکمیل کے درجے تک پہنچائیں۔ لیکن ابھی عمر کی صرف سترہ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ خاندان

کے بزرگوں کو یہ شوق پیدا ہوا کہ اُن کی شادی کر دیں۔ الطاف حسین کو اس وقت شادی کی ذرا بھی خواہش نہ تھی۔ ابھی انھوں نے علم کے دریا سے ایک چلّو ہی پیا تھا اور جی بھر کر سیراب ہونا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر شادی ہو گئی تو تعلیم کو ترک کر کے روزی کمانے کی فکر کرنی ہو گی لیکن بزرگوں کو اس کی کیا پروا کہ خود الطاف حسین کیا چاہتا ہے؟ اُن کے بڑے بھائی نے اپنے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النسار سے اُن کا بیاہ ٹھیرا دیا۔ الطاف حسین کے لیے بھائی کا حکم گویا باپ کا حکم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوجوان اکثر اپنی بڑی سے بڑی خواہش اور آرزو کو بزرگوں کے حکم پر قربان کر دیتے تھے اور ماتھے پر بل تک نہ لاتے تھے۔ الطاف حسین بچپن سے دیکھتے آئے تھے کہ بزرگوں کی کسی رائے سے اختلاف کرنا یا ان کے حکم سے انکار کرنا خاندانی روایات اور آدابِ شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتے تھے اور ان کی خواہش کو رَد کر کے ان کے دل کو دکھ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لہٰذا وہ سعادت مندی کے تقاضے سے مجبور ہو گئے اور سترہ سال کی عمر میں ان کی شادی رچا دی گئی۔

شادی تو ہو گئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اُس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا بار ان کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ دلّی جا کر جو اس اجڑی حالت میں بھی علوم و فنون کا مرکز تھی تحصیل علم کریں۔ دلی اگرچہ پانی پت سے صرف پچپن میل ہی ہے لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ دلّی جانا گویا کسی دوسرے ملک کا سفر کرنا تھا۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا اور پردیس جا کر جلدی واپس آنا مشکل ہو جاتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے کہ انھیں دلّی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب اُن کی بیوی میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی سامان کے پاپیادہ دلّی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی اور بیل گاڑی میں بھی کچھ مسافت طے کی ہو۔

علم کا یہ سچا شیدائی جب دلّی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا۔ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اُس زمانے کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا

اتنا البتہ معلوم ہے کہ جامع مسجد کے قریب حسین بخش کا مدرسہ تھا جس میں مشہور فاضل اور واعظ مولوی نوازش علی درس دیتے تھے۔ الطاف حسین اس میں داخل ہو گئے اور بہت عسرت کے ساتھ اور تکلیف اٹھا کر علم کی دولت حاصل کرنی شروع کی۔ انھیں طلبِ علم کی دھن میں آرام و آسائش کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ تکیہ نہ ہوتا تو سر کے نیچے اینٹیں رکھ لیتے، کھانے کو نہ ملتا تو رات کو بھوکے سو رہتے۔ روح کی بھوک اور دل کی پیاس بجھانے میں ان چیزوں کی طرف دھیان ہی نہ جاتا تھا۔

مولوی نوازش علی کے علاوہ دلی کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد اور شمس العلما میاں نذیر حسین کے درس سے بھی استفادہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھوڑا بہت شروع ہو چکا تھا اور قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر الطاف حسین اس دنیا سے بالکل بے خبر تھے۔ اُن کے وطن پانی پت میں انگریزی تعلیم کو گناہ اور بدعت سمجھا جاتا تھا اور انگریزی مدرسوں کو "جہلے" (جہالت کی جگہ) کہا جاتا تھا۔ دلی آئے تو جس مدرسے میں پڑھنا شروع کیا وہاں بھی انگریزی پڑھنے کو عیب اور انگریزی دانوں کو جاہل سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے اگرچہ الطاف حسین ڈیڑھ برس دلی میں رہے اور ان کے دل میں علم کی سچی لگن موجود تھی لیکن کبھی بھول کر بھی انگریزی مدرسے میں پڑھنے یا اُسے جا کر دیکھنے تک کا شوق نہ پیدا ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اُنھوں نے محض انگریزی کتابوں کے ترجمے پڑھ کر وہ کچھ حاصل کر لیا جو لوگ انگریزی تعلیم میں ساری زندگی کھپانے کے بعد بھی نہیں پا سکتے۔

دلی کے زمانۂ قیام میں جب اُن کی عمر غالباً اٹھارہ سال کی تھی، انھوں نے عربی میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ یہ اُن کی سب سے پہلی تصنیف تھی۔ مصنف کو اپنی پہلی تصنیف سے جو محبت ہوتی ہے اُسے کون اہلِ قلم نہیں جانتا۔ پہلی تصنیف اُس کی ادبی زندگی کا سنگِ بنیاد ہوا کرتی ہے اور اس موقعے پر اس کو قدر دانوں کی حوصلہ افزائی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اُن کی پہلی تصنیف کا جو نہایت محنت اور خوبی سے لکھی گئی تھی جو حشر ہوا وہ قابلِ ذکر ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر یوں لکھا ہے:

"غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ

نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں تھا۔ جسے اُن کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اُسے چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چونکہ ایک وہابی مولوی کی تائید میں تھا، اس لیے چاک کر دیا گیا۔"

اُس زمانے میں علم وفن کی شمع دلی میں بجھنے سے پہلے بھڑک اُٹھی تھی۔ علاوہ اور علوم وفنون کے شاعری بھی فروغ پر تھی۔ الطاف حسین کو بھی اکثر مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوتا۔ فطرت نے جو خداداد جوہر اُن کو ودیعت کیا تھا وہ اُبھرنے لگا۔ خوش قسمتی سے اُن کی ملاقات مرزا غالب سے ہو گئی۔ اُس زمانے میں مرزا غالب کا کلام عام طور پر مقبول نہ تھا۔ لیکن خاص خاص لوگ اُس کی بے حد قدر کرتے تھے۔ الطاف حسین کو مرزا کا کلام دل سے پسند آیا۔ وہ اکثر اُن کے پاس جاتے اور اُن کے اُردو فارسی کے مشکل شعروں کا مطلب خود اُن سے سمجھا کرتے۔ اسی سلسلے میں اُنھوں نے ایک آدھ غزل اُردو اور فارسی کی لکھ کر مرزا غالب کو دکھائی۔ غالب بڑے سخت نقاد تھے اور اس پر بہت خفا ہوا کرتے تھے کہ ہر کس و ناکس شعر کہنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اس سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کے ابتدائی کلام کو دیکھ کر وہ پھڑک گئے۔ انھوں نے وہ جوہرِ قابل پرکھ لیا جو آگے چل کر ایک دنیا کو مسحور کرنے والا تھا۔ اُنھوں نے حالی سے کہا "میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" الطاف حسین کو اپنے تعلیمی مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیکن غالب کی ہمت افزائی کی بنا پر انھوں نے شعر گوئی کی تھوڑی بہت مشق جاری رکھی۔ اُس زمانے میں خستہ تخلص کرتے تھے۔

الطاف حسین دل لگا کر تعلیم پا رہے تھے اور ساتھ ہی شعر وسخن کی محفلوں سے بھی لطف اٹھا رہے تھے اور شعر گوئی بھی شروع کر دی تھی کہ اُن کے دلی میں موجود ہونے کی خبر پانی پت پہنچ گئی۔ خاندان والے سن کر بے قرار ہو گئے۔ بڑے بھائی اور کئی دوسرے عزیز دلی آئے اور انھیں مجبور کیا کہ گھر واپس چلو۔ اگرچہ اُن پر تعلیم چھوڑنا سخت شاق تھا مگر بھائی کی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ بادلِ ناخواستہ ۱۸۵۵ء میں پانی پت واپس آ گئے مگر یہاں پہنچ کر پھر تحصیلِ علم میں اس طرح

محو ہو گئے کہ کسی چیز کی خبر نہ رہی۔

الطاف حسین کو گھر آئے ڈیڑھ برس گزر گیا۔ وہ اپنے مطالعے میں مصروف تھے۔ لیکن عزیزوں اور دوستوں کا مسلسل اصرار تھا کہ فکرِ معاش کرو۔ اس عرصے میں غالباً ایک بچّہ بھی ہو چکا تھا جب لوگوں کا اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً اپنی تعلیم کو چھوڑ کر ۱۸۵۶ء میں تلاشِ معاش میں گھر سے نکلے اور آخر کار حصار میں انھیں تھوڑی سی تنخواہ پر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔

الطاف حسین نوکر تو ہو گئے مگر انھیں اطمینان سے کام کرنا یہاں بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ زمانہ ہی انتشار اور پریشانی کا تھا۔ ملک میں ایک طرف انگریزی حکومت کا تسلّط رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا، دوسری طرف اس حکومت کے خلاف لوگوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات اندر ہی اندر نشوونما پا رہے تھے جو ایک دم آتش فشاں مادّے کی طرح پھٹ پڑے۔ اور ۱۸۵۷ء میں وہ ہنگامہ شروع ہو گیا جسے غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سارے ملک خصوصاً شمالی ہند میں ایک قیامت برپا تھی کسی کو اپنا جان و مال محفوظ نظر نہ آتا تھا۔ حصار میں بھی جہاں الطاف حسین نوکر تھے سخت گڑبڑ مچی ہوئی تھی۔ ایسے وقت ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے وطن میں اپنے عزیزوں کے ساتھ ہو۔ الطاف حسین نے اللہ کا نام لیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر حصار سے پانی پت روانہ ہو گئے۔ راستے میں اُن پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ آپ کو ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کے بیان سے ہوگا:

"والد جس گھوڑی پر سفر کر رہے تھے وہ بھی ڈاکوؤں نے چھین لی اور آپ کے پاس صرف ایک حمائل (چھوٹا قرآن شریف) باقی رہ گئی تھی۔ جب پانی پت پہنچے تو پیدل سفر کی صعوبت اور راستے میں ناموافق اور ناوقت غذاؤں کی وجہ سے آپ کو اسہال کی شکایت ہو گئی جو ایک سال سے زیادہ رہی اور آخر پانی پت کے مشہور طبیب حکیم خورشید صاحب مرحوم نے والد کو گُڈّیوں (بکرے کی گھٹنے کی ہڈّی) کا پلاؤ بتایا اور اس سے مرض کا ازالہ ہو گیا۔ جوانی میں والد مرحوم کے قوےٰ بہت اچھے تھے اور آپ کو کسرت کا بھی شوق تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس حصار سے پانی پت تک کے سفر میں جو تکلیف اٹھائی اس نے اُن کی صحت پر بہت بڑا اثر ڈالا اور آپ اکثر معدے اور سینے اور پھیپھڑے کے امراض میں مبتلا رہنے لگے باوجود انتہائی احتیاط کے جو آپ کی عادت تھی۔"

بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح پانی پت پہنچ ہی گئے۔ عزیز و اقارب نے زندہ سلامت دیکھا تو جان میں جان آئی۔ پانی پت اگرچہ فتنہ و فساد سے بچا رہا لیکن اس وقت تک لوگوں کو سخت خطرہ تھا۔ دِلّی جہاں یہ قیامت بپا تھی پچیس کوس ہی تو تھی! وہاں کے تباہ حال خاندانوں میں سے بہت سے لوگوں نے پانی پت کو منتخب کیا اور دِلّی سے بھاگ کر یہاں آ گئے۔ پانی پت والوں نے اس وقت سچّی انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اپنے گھروں اور دلوں کے دروازے ان مصیبت کے ماروں کے لیے کھول دیے۔ الطاف حسین اس وقت بیس سال کے نوجوان تھے مگر تجربہ متانت اور زمانہ شناسی بوڑھوں جیسی تھی۔ دِل ایسا درد مند اور حسّاس پایا تھا کہ چیونٹی کی تکلیف پر بھی دکھ جاتا تھا پھر کیسے ممکن تھا کہ مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد نہ کرتے۔ دوسروں کے ساتھ وہ بھی اس کام میں لگ گئے۔ الطاف حسین کے گھر میں جن لوگوں نے پناہ لی تھی اُن میں سے بعض یہیں کے ہو رہے۔ ایک مصیبت زدہ خاندان کی کفالت اُن کے بھائی بھاوج نے ہمیشہ کے لیے اپنے ذمّے لے لی تھی۔ ایک اور اسّی سالہ بوڑھی بی مثریا کو میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ بی بی غدر میں دس سال کی تھیں۔ عقد ہو چکا تھا، رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا اور ماں، باپ، عزیز و اقارب، شوہر سب مارے گئے اور اس کم سن لڑکی نے الطاف حسین کے خاندان میں آ کر پناہ لی اور پھر اپنی ساری عمر انتہائی شرافت اور عزت و خود داری کے ساتھ اس گھر میں گزار دی۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے رہے سلائی کر کے، چھالیہ کاٹ کے، طرح طرح کے کشیدے کے کام اُجرت پر کرتی اور اپنا خرچ چلاتی رہیں۔ آخر عمر میں مولانا حالؔی کی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ نے ان کی دیکھ بھال اور خدمت کا بار اپنے ذمّے لے لیا تھا اور اُن کی وفات تک اُن کی ایسی خدمت کرتی رہیں جیسے کوئی بڑی سعادت مند بیٹی اپنی ماں کی کرتی ہے۔

خواجہ الطاف حسین بھی جب تک زندہ رہے بی مثریا کا بڑا لحاظ اور خیال کرتے تھے۔ عمر بھر بی مثریا کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اسی خاندان کی ایک معزز فرد نہیں ہیں۔

غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد بھی برسوں تک ملک کی حالت ایسی رہی کہ ہر شخص گھر سے نکلتے اور باہر جاتے گھبراتا تھا۔ کاروبار، دفتر، اسکول، کالج سب بند تھے۔ جو تھا وہ اپنی جگہ سہما ڈرا ہوا۔ سرکارِ انگریزی نے انتقام کے جوش میں دِلّی کے بیشتر معزز گھرانوں کو نیست و نابود

کر دیا۔ جس کسی پر کسی دشمن نے جھوٹ موٹ کوئی الزام لگا دیا اسے بے تکلف سولی پر چڑھا دیا جاتا
تھا۔ کہتے ہیں کہ دلّی کا کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں سُولی نہ کھڑی کی گئی ہو!

اس زمانے میں الطاف حسین کو مسلسل چار سال پانی پت میں رہنا پڑا۔ نوکری چھوٹ
چکی تھی، کسی اور نوکری کا فی الحال کوئی امکان نہ تھا اس لیے غالباً خیر خواہوں نے بھی یہ اصرار کرنا
چھوڑ دیا ہو گا کہ ملازمت کرو۔ الطاف حسین نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور پوری توجّہ اپنی تعلیم
کی تکمیل کی طرف کر دی۔ وہ خود اپنی اس زمانے کی تعلیم کا حال یوں لکھتے ہیں: "اس زمانے
میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان
سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں
میں کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم و ادب
کی کتابیں شرح و لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا۔" غالباً اسی زمانے میں الطاف حسین نے
اپنا مشہور تخلص حالیؔ اختیار کیا۔

حالیؔ کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین مرحوم کی پیدائش غالباً اس وقت ہو چکی تھی جس
زمانے میں وہ دلّی سے واپس آکر پانی پت رہ رہے تھے۔ حالیؔ کے بھائی خواجہ امداد حسین نے جو
لاولد تھے انھیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ حالیؔ جب اُن کا ذکر کرتے ہیں تو "برادر زادہ" کہہ کر کرتے
ہیں۔ اس عرصے میں اُن کے کئی اور بچے پیدا ہوئے جن میں بعض مر گئے۔ اُن کی بیٹی عنایت فاطمہ
جو زندہ رہیں وہ بھی اسی زمانے میں پیدا ہوئی تھیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کی
ولادت ۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔

اب حالیؔ کی ذمّہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ خاندانی جائداد بہت تھوڑی سی تھی۔ سارے خاندان
کا بار بڑے بھائی کی تنخواہ پر تھا۔ آخر حالیؔ کو پھر روزی کی فکر میں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ تلاش
معاش میں دلّی روانہ ہوئے۔ دلّی کو غدر نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ مگر اس لُٹنے کے بعد بھی اس
کی پرانی شان کچھ نہ کچھ باقی تھی۔ اب بھی علم و فن اور شعر و سخن کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ حالیؔ دلّی
آئے تو شعر و سخن کا ذوق پھر تازہ ہو گیا اور وہ علمی مجلسوں اور ادبی محفلوں میں آنے جانے لگے۔

دلّی میں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہو گئی۔ شیفتہ اس ذہین، شریف، نیک
سیرت نوجوان سے جس نے اس کم سنی ہی میں علم و فضل میں غیر معمولی قابلیت پیدا کر لی تھی اور جس کا
ذوقِ سخن نہایت پاکیزہ تھا، بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے حالیؔ کو جہانگیر آباد بُلا کر اپنے بچّوں کی اتالیقی
اُن کے سپرد کر دی۔ اور اس طرح آٹھ سال کے قریب حالیؔ اور شیفتہ ایک دوسرے کے ساتھ
رہے۔ شیفتہ سے حالیؔ کو گہرا تعلق تھا اور وہ اُن کی سخن فہمی اور ذوقِ شعر کے بڑے قائل تھے۔ ان
کا اپنا بیان ہے کہ انھیں غالبؔ کی اصلاح سے وہ فائدہ نہیں ہوا جو شیفتہ کی صحبت سے ہوا: "نواب
مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دلّی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو
میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا ذوق رکھتے تھے شناسائی ہو گئی اور سات
آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

"نواب صاحب جس درجے کے شاعر تھے اُس کی بہ نسبت اُن کا مذاق شاعری بمراتب
بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ اُنھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی کلام مومنؔ خاں کو دکھایا تھا مگر
اُن کے مرنے کے بعد مرزا غالبؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و
سخن کا شوق جو مدّت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور اُن کی صحبت میں میرا میلانِ طبعی جو اب
تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اس زمانے میں اردو اور فارسی
کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُنھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد
سے اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے
مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے
کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لُطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی
باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ان خیالات
کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔"

حالیؔ کا مستقل قیام تو جہانگیر آباد میں رہتا تھا مگر دلّی بھی شیفتہ کے ساتھ اکثر آتے اور رہتے
تھے۔ مرزا غالبؔ سے جو دونوں کے دوست اور استاد تھے، خوب صحبتیں گرم رہا کرتی تھیں۔

حالی کی جوانی کی عمر تھی۔ طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا اور جیسا کہ نوجوانی کے عہد کا دستور ہے عقائد میں سختی بھی تھی۔ مولوی استادوں کے خیالات کا رنگ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔ غالب سے دلی محبت تھی اور لازماً ان کی آخرت کی فکر بھی ستاتی تھی۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ غالب بڑھاپے کے باوجود اب تک شراب پیے جاتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی نماز نہیں پڑھتے تو انھیں قدرتی طور پر اس کا بہت رنج ہوا۔ وہ خود لکھتے ہیں "۔۔۔۔۔۔ جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہو جاتا ہے اسی قدر اس بات کی زیادہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات و مغفرت کے لیے ناگزیر ہے۔ چونکہ مرزا کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لیے ہمیشہ اُن کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔"

چنانچہ حالی نے غالب کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں انھیں نماز پڑھنے کی تاکید کی، فرض کا احساس دلایا اور درخواست کی کہ "آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نمازِ پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔" اس زمانے میں غالب کے پاس بہت سے خط آیا کرتے تھے جن میں اُن کو بے دین اور ملحد اور کافر اور خدا جانے کیا کیا لکھا ہوتا تھا۔ بعض خطوں میں تو گالیاں تک ہوتی تھیں۔ غالب ان کو بکواس سمجھتے اور پروا نہ کرتے لیکن حالی کے خط سے انھیں بہت صدمہ ہوا۔ وہ پھٹ پڑے اور بہت رنج اور غصّے کا اظہار کیا۔ اگلے دن ایک غزل بھیجی جس میں اس نصیحت کا شکوہ تھا۔ حالی نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ لکھا۔ اس کے جواب میں غالب نے یہ قطعہ لکھ کر شیفتہ کے پاس بھیجا ؎

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری	ہمی بلطف تو خود را امید وار کنم
چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید	تو گر شفیع نہ گردی بگو، چہ کار کنم
دو بارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال	براں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عباداتِ عمرِ پیشینہ	دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

حالی نے سخت ندامت کے ساتھ ایک اور قطعہ لکھ کر بھیجا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

تو اے کہ عذر فرستادۂ ای بہ سوے رہی
سزد کہ جانِ گرامی بر آں نثار کنم
نماند قاعدۂ شکرِ بے ریا بہ جہاں
اساسِ دوستی از شکوہ استوار کنم
چو شکوہ جُز بہ تقاضاے دوستی نبود
زنجیر شکر و شکایت ز دوست دار کنم

آخر غالب نے کہا "بس اب بیت بخشی موقوف"۔ غالب کی شکایت حالی سے محبت ہی پر مبنی تھی۔ وہ حالی کو بہت چاہتے اور بڑی عزت کرتے تھے۔

اپنی غلطی کا احساس اور اس کا صاف صاف اعتراف صرف عالی ظرف لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ حالی کو نوجوانی کی اس معمولی سی غلطی کا اور اس کا کہ جوش میں وہ غالب سے بے ادبی کر بیٹھے عمر بھر افسوس رہا۔ یادگارِ غالب میں انھوں نے اس واقعے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں کس فراخدلی سے اپنے اس زمانے کے عقائد پر اعتراض کرتے ہیں: "یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتّر فرقوں میں سے صرف اہلِ سنّت کو اور اہلِ سنّت میں سے صرف حنفیّہ کو اور ان میں سے بھی صرف چند لوگوں کو مغفرت کے لائق جانتے تھے گویا دائرۂ رحمتِ الٰہی کو کوئن وکٹوریہ کی وسعتِ سلطنت سے بھی، جس میں ہر مذہب و ملّت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں، زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے۔"

۱۸۶۹ء میں شیفتہ کا انتقال ہو گیا اور حالی کو پھر معاش کی فکر ہوئی۔ اس مرتبہ لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انھیں ایک جگہ مل گئی۔ یہاں اُن کے ذمّے یہ کام تھا کہ انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں پر نظرِ ثانی کریں اور اُن کی عبارت درست کریں۔ حالی کی زندگی کا رُخ پلٹنے میں اس ملازمت کو بڑا دخل ہے۔ وہ چار برس تک لاہور میں یہ کام انجام دیتے رہے اور اس بہانے قدرت نے انگریزی نہ پڑھ سکنے کی کمی پوری کر دی۔ حالی انگریزی زبان اور ادب کی بہت سی کتابوں کے

مطالب سے واقف ہوگئے۔ بہت سے وہ خیالات جو اُن کے اپنے دل کی گہرائیوں میں موجود تھے لیکن وہ ان کو پوری طرح ظاہر نہ کرسکتے تھے اب اُن پر واضح ہوگئے۔ اردو اور فارسی ادب اور شاعری میں جن کمیوں کو وہ محسوس کرتے تھے اب انگریزی ادب کے مطالعے سے اُن پر یہ ظاہر ہوا کہ حقیقت میں وہ کیا ہیں۔ گویا انگریزی ادب کی تنقیدی کتابیں پڑھ کر اُنھیں یہ محسوس ہوا کہ:

گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اب انھیں ادب کے صحیح مقام کا اندازہ ہوا۔ اور اُنھوں نے جانا کہ ادب کے ذریعے کس طرح انسانوں کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ یہ اثر رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ روز بروز حالی کی نظروں میں مشرقی لٹریچر خاص کر فارسی لٹریچر کی، جس سے اُب تک اُنھیں بہت لگاؤ تھا، وقعت کم ہونے لگی اور مغربی ادب کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ اُن پر نہ صرف مغربی ادب کا گہرا اثر پڑا بلکہ انگریزی زبان سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنی نثر میں انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور کہیں کہیں تو شعر میں بھی لے آتے ہیں۔

حالی لاہور ہی میں تھے کہ مولوی محمد حسین آزاد نے جو عرصے سے اردو شاعری کی اصلاح کی فکر میں تھے، اپنا ایک پرانا ارادہ پورا کیا، اور ۱۸۷۴ء میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرعِ طرح کے شاعروں کو کوئی موضوع طبع آزمائی کے لیے دیا جاتا تھا کہ وہ جس اسلوب سے اور جس بحر میں چاہیں اپنے خیالات نظم کریں۔

حالی تو اس موقعے کے انتظار میں تھے کہ بے صرف غزل گوئی کو چھوڑ شاعری کی کوئی نئی راہ اختیار کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ بڑی خوشی اور گرم جوشی کے ساتھ انھوں نے اس نئی وضع کے مشاعرے کا خیر مقدم کیا اور اس کے چار جلسوں کے لیے چار مسلسل نظمیں یا مثنویاں لکھیں۔ برکھارت، اُمید، تعصب و انصاف اور حبِ وطن۔ یہ چاروں نظمیں بڑی دلکش، شیریں اور دلچسپ ہیں۔ خصوصاً حبِ وطن اپنا جواب آپ ہی ہے۔ حالی سے پہلے اور غالباً بعد میں بھی اس موضوع پر اتنی پُرخلوص، پُرکیف، پُراثر نظم کسی نے نہیں کہی۔

لاہور کے قیام کے زمانے میں حالی نے نثر میں بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب تریاقِ مسموم

لکھی جو اپنے ایک ہم وطن مسلمان کی کتاب کے جواب میں تھی جو اُس نے عیسائی ہوجانے کے بعد لکھی تھی۔ ایک جیالوجی کی کتاب کا عربی سے ترجمہ کیا اور اس کا حقِ تصنیف بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ تیسری کتاب مجالس النسا لکھی جس میں قصّے کے پیرائے میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور بچوں کی پرورش کے بہترین اصول اور طریقے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب اس زمانے میں بہت مقبول ہوئی اور عرصۂ دراز تک پنجاب کے زنانہ اسکولوں کے کورس میں شامل رہی اور کرنل ہالرائڈ نے جو علمی و ادبی تصانیف کے بڑے قدرداں تھے اس پر چار سو روپے کا انعام پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے حالی کو دلایا تھا۔

حالی تقریباً چار سال لاہور میں رہے مگر اُن کا دل وہاں نہیں لگا۔ اُن کو دلی سے محبت تھی اور ہونی ہی چاہیے تھی۔ پانی پت اُن کا وطن تھا اور دلی ان کا وطنِ ثانی مگر وطنِ ثانی کی محبت اصلی وطن سے بھی بڑھ گئی تھی۔ اُن کا دل دلی اور دلی کی صحبتوں کے لیے ترستا تھا۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رہے لاہور میں آکر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

برکھارت میں بھی وطن کی یاد اور وطن کی خوب صورت برسات اور صحبتوں کا ذکر بڑے پُراثر اور دلکش انداز میں کیا ہے ؎

بیزار اک اپنی جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو — اک باغ میں ہے پڑا الپ جو

ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آکے لگی تڑپنے پیہم — اور پڑنے لگی پھوار کم کم
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا　　فرقت میں تمھاری آئے برکھا
پردیس میں سچ ہے کیا ہو دل شاد　　جب دل میں بھری ہو دیس کی یاد

تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز　　پکڑا گیا دل سُن اس کی آواز
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالیؔ

انھیں لاہور کی آب و ہوا بھی موافق نہیں تھی اور وہاں برابر صحت خراب رہتی تھی۔ آخر دلی جانے کی صورت نکل آئی اور وہ اینگلو عربک اسکول میں مدرّس ہو کر یہاں آ گئے۔ یہاں انھوں نے کئی سال تک بڑی محنت، لیاقت اور دل سوزی سے طالب علموں کو پڑھایا۔ جن لوگوں نے حالیؔ سے درس لیا تھا وہ ہمیشہ اُن کے پڑھانے کے معترف اور مدّاح رہے۔

دلی آکر بھی حالیؔ کو دلی سکون نصیب نہ ہوا۔ اب وہ ایک نئی الجھن اور ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے۔ نوجوانی کا دور گزر چکا تھا۔ عشقیہ شاعری کا ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ گُل و بُلبل کی داستان سے جی سیر ہو چکا تھا۔ داخلی زندگی کا وہ دور جس میں انسان صرف اپنی ذات کو دیکھتا اور خود اپنی پرستش کرتا ہے گزر گیا تھا اور اب انھوں نے ایک بہت وسیع دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اب بجائے عشق کے روگ کے قوم کا درد اُن کو ستا رہا تھا۔ ملک اور قوم کی زبوں حالی نے اُن کے دَرد آشنا اور حسّاس دل پر بہت اثر ڈالا۔ شعر و ادب کا موجودہ مذاق اس نازک زمانے میں نکمّا اور فضول معلوم ہونے لگا۔ جب جہاز ڈوب رہا ہو تو مسافروں کا چنگ و رباب پر گانا کیا بھلا معلوم ہو سکتا ہے؟ حالیؔ کو اپنا ۲۰ ـ ۲۲ سال کا سرمایۂ شعر بالکل نکمّا اور بے قدر نظر آیا۔ کسی برتر اور اعلیٰ کام کا ولولہ اُن کے دل میں ابھر رہا تھا۔ شعر و ادب میں اصلاح، قوم کو ابھارنے کا جذبہ، انسانوں کو انسان بنانے کی تمنّا، غرض مختلف جذبات تھے جو دل میں موجزن تھے مگر ابھی تک انھیں صحیح راستے کا علم نہ ہو سکا تھا کہ کدھر جائیں ...... اُن پر ایک افسردگی اور یاس کی کیفیت طاری تھی۔ اس زمانے کے احساسات کو انھوں نے مسدس حالیؔ کے دیباچے میں لکھا ہے: ’’بچپن کا زمانہ جو حقیقت میں دنیا کی بادشاہت

کا زمانہ ہے، ایک ایسے دلچسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے نہ خار دار جھاڑیاں تھیں نہ آندھیوں کے طوفان نہ بادِ سموم کی لپٹ تھی۔ جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دلفریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اُسی قدر وحشت خیز بھی تھا ...... باغِ جوانی کی بہار اگرچہ قابلِ دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذّت اٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا ؎

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے　　اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتّہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا ...... بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اُسی ایک چکّر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں ...... نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدانِ وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں۔ مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین تک محدود رہی ہو اُن سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اِس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمّی گردش میں ہاتھ پاؤں چُور ہو گئے تھے اور طاقتِ رفتار جواب دے چکی تھی لیکن پاؤں میں چکّر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔‘‘

آخر خدا نے حالیؔ کو اس ذہنی کشمکش سے نکالنے کے لیے ایک مردِ بزرگ و دانا کو بھیجا جس مردِ خدا نے مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو پار لگایا تھا، حالیؔ کو بچانے کا سہرا بھی اُسی کے سر رہا۔

’’ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے جو اُس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اُس کے ساتھ افتاں

وخیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں۔۔۔۔ لیکن وہ اولوالعزم آدمی جوان سب کا رہنما ہے اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اُس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اُس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ قدم اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں　　　دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے"

غرض حالیؔ کی سرسید سے ملاقات ہوئی تو وہ اُن کی زبردست شخصیت، اُن کی مضبوط سیرت اور سب سے زیادہ اُن کے بلند مقصد سے بے حد متاثر ہوئے اور دل وجان سے سرسید کے ساتھ ہو گئے اور اپنی باقی ۴۸ سالہ زندگی کا ہر سانس اس مقصد کے لیے وقف کر دیا کہ اپنی خوابِ غفلت میں سرشار قوم کو جگانا اور اُسے ترقی کے راستے پر چلنا سکھانا ہے۔۔۔۔۔۔ اُس کے بگڑے مذاق کو سنوارنا اور گرے ہوئے اخلاق کو پھر سے بلند کرنا ہے۔

"زمانے کا نیا ٹھاٹ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔۔۔۔۔۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے۔۔۔۔۔۔ اکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔۔۔۔ عزیز ذلیل ہو گئے، شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے، اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے۔۔۔۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔ ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔ اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ رہے اور لکھ چکے ہیں۔ مگر نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے، اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصّہ ہے۔ قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔۔۔۔۔"

سرسید کی اس تحریک نے حالیؔ کے دِل پر جادو کا سا اثر کیا اور انھیں کے الفاظ میں "ہر چند

کہ اس حکم کی بجاآوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا، ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی، دل ہی سے نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا، باسی کڑھی میں ابال آیا، افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انھیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔۔۔۔۔"

اور باوجود ساری فکروں اور پریشانیوں کے حالیؔ نے اس نئی دھن کو نہ چھوڑا، انھوں نے دل اور دماغ کی بہترین قوتوں سے کام لے کر وہ مشہور ومعروف نظم تصنیف کی جس نے نہ صرف مسدس حالیؔ کے امر نام سے ادب میں اپنے لیے ایک مخصوص مقام پیدا کیا بلکہ سارے ملک بالخصوص مسلمانوں میں ایک ہلچل ڈال دی۔ اس کتاب کی ایک جلد حالیؔ نے اپنے عزیز اور محترم دوست سرسید کے پاس نہ بھیجی۔ سرسید کے دل پر اس کے پڑھنے سے جو اثر ہوا اس کو انھوں نے بڑے دلکش انداز میں اپنے خط میں بیان کیا ہے جو باوجود اکثر دُہرائے جانے کے اس قابل ہے کہ اس کو یہاں نقل کیا جائے۔" جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔۔۔۔۔۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغے، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعر وشاعری ہے بالکل مبرا ہے کیوں کر اس خوبی اور خوش بیانی اور موثر طور پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشمِ نم پڑھے نہیں جاتے۔ حق ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔۔۔۔۔۔ بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اُس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو کہوں گا حالیؔ سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔۔۔"

نقادوں نے مسدس حالیؔ کی بڑی تعریف کی ہے لیکن سرسید کا اندازِ بیان اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایک دردمند شاعر کے دل کی لگن کو ایک سچے "سخن فہم اور درد آشنا انسان نے سمجھا اور ایک اچھوتے اور دلنشیں انداز میں اُس کی داد دی۔

سب سے پہلے سرسید کے اخبار "تہذیب الاخلاق" میں "مسدس حالیؔ" قسط وار چھاپا گیا۔ کتاب کی شکل میں وہ بعد میں شائع ہوئی۔

مسدس کی مخالفت بھی اتنے ہی زور و شور سے کی گئی جس طرح تعریف، اور اکثر اخباروں نے مسدس کے خلاف مہینوں برسوں اپنے صفحات سیاہ کیے لیکن مخالفت اور تعصب کا یہ طوفان چھٹ گیا اور مسدس جس مقام پر تھا وہیں رہا۔ غرض اس طرح بقول ڈاکٹر عابد حسین "سرسید کی بدولت قوم کو شاعر مل گیا اور شاعر کو قوم" اور اس کے بعد سے حالی کی زندگی اور ان کی شاعری تمام تر قومی خدمت کی نذر ہوئی۔

اس مرتبہ حالی تقریباً بارہ برس تک دلی میں مقیم رہے۔ اور اس دوران میں علاوہ سرسید کا ہاتھ بٹانے اور علی گڑھ کالج کی ہر ممکن مدد کرنے کے (جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا) وہ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی کافی وقت صرف کرتے رہے۔ حیاتِ سعدی اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا ہے کہ اس سے پہلے وہ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کی تصحیح کر کے شائع کر چکے تھے۔ میں نے اس بار اس کتاب کی بہت جستجو کی مگر دستیاب نہ ہو سکی۔ البتہ مکتوباتِ حالی میں مولوی احمد بابا صاحب مخدومی کے نام ایک خط میں حالی نے خود اس کا ذکر لکھا ہے "آپ کا ایک اور کارڈ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کی طلب میں پہنچا۔ بے شک یہ سفرنامہ مدت دراز ہوئی میں نے چھپوایا تھا۔ سو بہت عرصہ ہوا اس کی جلدیں ختم ہو گئیں۔۔۔۔۔"

ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی جس میں حالی کی نثر و نظم فارسی و عربی جمع کی گئی ہیں، اس سفرنامے پر ان کا مبسوط مقدمہ فارسی میں ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر خسرو کا یہ سفرنامہ نواب ضیاالدین احمد رئیس لوہارو کے کتب خانے میں موجود تھا جہاں سے ایک فرانسیسی عالم موسیو شیفر نے اسے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے منگایا تھا۔ حالی نے بھی غالباً وہیں اس کتاب کو دیکھا اور اس کی ترمیم و اصلاح کر کے اسے دوبارہ شائع کیا تھا۔ حکیم ناصر خسرو کے بارے میں بہت سی غلط سلط روایات مشہور تھیں اور ان کی زندگی کے حالات بھی غلط سلط بیان کیے جاتے تھے۔ حالی نے ان کے کلام کی مدد سے بہت محنت اور کاوش کے ساتھ ان کی زندگی کے صحیح حالات اور واقعات جمع کیے اور اس مشہور فلسفی عالم کا یہ سفرنامہ شائع کرایا جو افسوس کہ اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ غالباً یہ ان کی سب سے پہلی اہم علمی کوشش تھی۔

۱۸۸۶ء میں خواجہ امداد حسین بیمار ہو کر علاج کے لیے دلی آئے اور حالی کے پاس ٹھہرے۔ پانچ چھ مہینے تک انتہائی لگن کے ساتھ حالی اپنے بھائی کا علاج کراتے رہے مگر ساری کوششیں بے کار گئیں اور ان کو بھائی کی جدائی کا داغ سہنا پڑا۔۔۔۔۔ حالی کے دل پر اس سانحے کا اثر بہت سخت ہوا۔ انھیں اپنے بھائی سے بڑی گہری محبت اور دلی عقیدت تھی۔ اُن کے انتقال پر جو چند شعر کا مرثیہ انھوں نے کہا ہے وہ دلی درد اور غم کا آئینہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل کی ایک ایک کیفیت بے اختیار شعر میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے ؎

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے	موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی	غم بھائی کا مر جانے کی ہے اس کے نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا	سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا	جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی
شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو	دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جینا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے	لذت نہیں جینے کی نصیب اُس کے اٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو!	کیا ڈھونڈتے ہو اُس کی طبیعت میں روانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر	ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

لیکن حالی کے دل پر جو کچھ بھی بیتی ہو انھیں تو ایک اعلیٰ مقصد کی خدمت کرنی تھی۔ اس لیے انھوں نے جوں توں اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر قومی اور ادبی خدمت میں لگ گئے۔

۱۸۸۷ء میں نواب آسماں جاہ جو ریاست حیدر آباد کے وزیرِ اعظم تھے، علی گڑھ آئے اور سرسید نے حالی کا اُن سے تعارف کرایا۔ سر آسماں جاہ حالی کے کمالِ شاعری اور اُن کے علم و فضل سے واقف تھے۔ اُن سے مل کر اُن کی بے مثل سیرت اور شخصیت دیکھ کر اور بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ ایسی غیر معمولی قابلیت کے آدمی کا فکرِ معاش میں پریشان رہنا زبردست قومی نقصان ہے۔ چنانچہ انھوں نے ریاست حیدر آباد کی طرف سے جہاں علم و ادب کی سرپرستی کی روایت چلی آتی تھی، امدادِ مصنفین کے صیغے سے پچھتر روپے ماہوار کا وظیفہ حالی کے نام جاری کرا دیا۔ یہ رقم آج حقیر معلوم ہو لیکن اُس

زمانے میں ایک متوسط حیثیت کا آدمی جس کو عیش و آرام کی فکر نہ ہو اس میں گزارا کر سکتا تھا۔ واقعہ دراصل یوں ہے کہ حالی سے سرسید نے پوچھا تھا کہ آپ کے لیے کتنا وظیفہ مقرر کیا جائے تو اُنھوں نے وہی رقم بتائی جو انھیں عربک اسکول سے ملتی تھی۔

حالی علمی آدمی تھے۔ ادبی مذاق رکھتے تھے۔ اور اُن کی طبیعت کو نوکری سے ذرا بھی مناسبت نہ تھی۔ مگر اس زمانے میں کیا آج بھی ہمارے دیس میں کوئی آدمی محض علم و ادب کی قلمی خدمت کر کے گزارا نہیں کر سکتا۔ حالی مجبوراً ملازمت کا ناپسندیدہ کام کرتے رہے تھے تاکہ خاندان کی کفالت کر سکیں۔ حیدرآباد کے اس وظیفے کو اُنھوں نے امدادِ غیبی سمجھا اور اِس پر قناعت کر کے ملازمت سے استعفا دے دیا اور اس اطمینان کے ساتھ جو صرف صاحبانِ استغنا کا حصہ ہے وہ علمی ادبی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

اینگلو عربک اسکول کی ملازمت ترک کرنے کے بعد بھی ممکن تھا کہ حالی دلی ہی میں رہتے۔ کیونکہ انھیں اپنے وطن سے زیادہ اس شہر سے محبت تھی۔ مگر اب دلی ان کے لیے ویرانے سے کم نہ تھی۔ اُن کے قدیم دوست اور رفیق، سخن فہم اور سخن سنج ساتھی، ہم نوا شاعر سب ایک ایک کر کے داغِ مفارقت دے چکے تھے۔ اور اُن کی ذہنی کیفیت کا نقشہ یہ تھا۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

اپنی ایک مشہور غزل میں جسے طویل نظمِ مسلسل کہنا زیادہ مناسب ہے، دلی کا مرثیہ ایسے جچتے انداز سے سنایا ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔

جتنے رستے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

غرض حالی نے بادلِ پُر درد دلی کو الوداع کہی اور اس کے بعد مستقل طور پر اپنے وطن پانی پت میں رہنے لگے۔

ان کا قدیم مکان محلہ انصار میں تھا۔ مگر وہ اس میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک تو وہ وسطِ شہر میں تھا جہاں لوگ ملنے جُلنے کے لیے بہت زیادہ آتے تھے اور حالی کو سکون سے کام کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے اس میں اُن کی بھاوج رہتی تھیں اور اکثر ان کی بڑی بہو اور اُن کے بچے آ کر رہا کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کے مشورے سے (جو بی۔ اے کر کے پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے) انھوں نے یہ طے کیا کہ محلہ سادات میں جو اسٹیشن سے نسبتاً دور اور حالی کا ننھیالی اور سسرالی محلہ تھا ایک مکان بنوایا جائے۔ زمین موجود تھی، اُس پر ایک چھوٹا سا مکان بھی تھا۔ اسے تڑوا کر اپنی ضرورت اور آرام کے مطابق مکان بنوانا تھا۔ اس لیے سب سے بڑا سوال روپے کا تھا۔ لیکن اقلیمِ شاعری کے اس تاجدار کے پاس روپیہ کہاں؟ یہ ضرور ہے کہ آجکل کے مقابلے میں اس وقت تعمیر میں بہت کم لاگت آتی تھی۔ پھر بھی روپیہ کتنا ہی کم لگے پر جمع کرنے ہی سے جمع ہو سکتا ہے۔ حالی کے پاس تھا ہی کیا سوا حیدرآباد کے پچھتر روپے ماہوار کے جس سے ان کا خرچ تو چل جاتا تھا مگر کچھ پس انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن خواجہ سجاد حسین نے طے کر لیا تھا کہ اپنے والدِ محترم کے آرام کے لیے مکان ضرور بنوائیں گے۔ اُن کی تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ مگر وہ بہت فیاض اور شاہ خرچ واقع ہوئے تھے اور روپیہ جمع نہ کر سکتے تھے۔ تاہم وہ برابر کچھ نہ کچھ روپیہ تعمیرِ مکان کے لیے بھیجتے رہے اور اس طرح تھوڑا تھوڑا کر کے مکان بنتا رہا اور آخر کار ۱۸۹۶ء میں تیار ہو گیا۔ اس میں نیچے پرانی قسم کا زنانہ مکان تھا۔ یعنی دالان سہ دری، صحنچیاں، کوٹھریاں اور صحن چبوترہ وغیرہ اوپر ایک خاصا بڑا ہوادار کمرہ، غسل خانہ اور دوسری طرف نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا۔ اوپر کا حصّہ دیوان خانہ تھا جس میں بڑے کمرے میں مولانا حالی رہتے تھے۔ آنے جانے

کے لیے ایک زینہ اندر گھر میں جاتا تھا دوسرا باہر دروازے میں نکلتا تھا۔ مرد باہر سے اوپر آجا سکتے تھے۔
مولانا حالی کے ملازم نانوں خاں اور عطاء اللہ ان کے ساتھ اوپر ہی رہتے تھے اور وہیں ان کا حقہ بھرنے اور چائے بنانے کا انتظام تھا۔ صبح شام کھانے کے وقت نیچے زنانے مکان میں آتے جہاں اُن کی بیوی بیٹی اور ان کا چھوٹا نواسہ رہتے تھے اور وہیں خاندان بھر کی عزیز عورتیں ملنے کے لیے آتی رہتی تھیں۔

حالی اپنے نئے مکان میں اُٹھ آئے۔ اُن کی آرزو تھی کہ سکون اور خاموشی سے علمی ادبی کام کرنے کا موقع ملے لیکن فرصت اور اطمینان بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ علاوہ گھر کی فکروں اور خاندانی پریشانیوں کے جن سے بحیثیت ایک فرض شناس اور شفیق سردارِ خاندان کے نبٹنا پڑتا تھا اور بھی بہت سے متفرق کام اور مصروفیتیں اُنھیں چین نہ لینے دیتی تھیں۔ علی گڑھ کالج کی امداد کے سلسلے میں لمبے لمبے سفر کرنا، تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے جانا، دوستوں، عزیزوں اور عقیدت مندوں کے اصرار پر اُن سے ملنے جانا، علی گڑھ میں علمی ادبی جلسوں میں جا کر شرکت کرنا۔ غرض اس قسم کے بہت سے سفر انھیں کرنے ہوتے تھے جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں سر سید کے ساتھ حیدرآباد بھی گئے اور علیگڑھ کالج کے لیے امید سے زیادہ چندہ لے کر واپس آئے۔ اسی زمانے میں حیدرآباد سے جو وظیفہ اُن کو ملتا تھا وہ ۷۵ روپے سے بڑھا کر سو روپے کر دیا گیا تھا۔

بہرحال ان سب مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے ادبی کاموں کے لیے وقت نکال ہی لیتے تھے۔ مقدمہ شعر و شاعری، یادگارِ غالب، بہت سے مختصر مضامین اور سر سید کی ضخیم سوانح عمری حیاتِ جاوید یہ سب دلی سے واپس آکر ہی لکھی گئی تھیں۔

۱۹۰۰ء میں جب کہ حالی بہت توجہ اور انہماک سے حیاتِ جاوید مرتب کر رہے تھے دفعتًا ان کی رفیقِ حیات کا ہیضے سے انتقال ہو گیا۔ یہ بڑی باسلیقہ، منتظم، ہمدرد، فیاض اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ تقریبًا نصف صدی کی مشترک زندگی میں حالی کی اور اُن کی کبھی اَن بن نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے کبھی اپنے شوہر کی علمی اور قومی زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی جیسا کہ بعض اہلِ علم کی بیویاں کیا کرتی ہیں۔ البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں، لیکن پھر بڑی جلدی پشیمان بھی ہو جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے حالی کا مزاج اتنا ہی نرم واقع ہوا

تھا۔ اس لیے کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

یہ آج سے پون صدی پہلے کا زمانہ تھا۔ جب میاں بیوی کی زندگی کے دو بالکل الگ الگ دائرے ہوا کرتے تھے۔ بیوی اپنے گھر کی چھوٹی سی سلطنت کی ملکہ اور شوہر اپنی زندگی اور اپنے وقت کا مالک تھا اور وہ اُسے جیسے چاہتا صرف کرتا تھا۔ لیکن اُسی کے ساتھ دونوں کے کچھ مخصوص فرائض بھی ہوتے تھے۔ بیوی کا کام تھا کہ وہ گھر کا انتظام، خاندان کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور شوہر کی خدمت کرے۔ میاں کا فرض تھا کہ وہ بیوی کے لیے خرچ مہیا کرے اور اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھے۔ باہر کے تمام معاملات کو سمجھے اور سلجھائے۔ آپس میں کتنی ہی محبت ہو لیکن وہ دل میں پوشیدہ رکھی جاتی تھی۔ کسی طرح بھی اس کا اظہار کرنا معیوب اور وضع داری کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

حالی اسی دور کے لوگوں میں سے تھے۔ اس لیے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ انھیں اپنی بیوی سے ایسی محبت تھی جیسی آج کل کی جاتی ہے (یا ظاہر کی جاتی ہے) ہاں اس زمانے کے معیار سے پرکھا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ازدواجی زندگی کامیاب تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے اور اپنے اپنے فرائض پوری ذمے داری سے ادا کرتے تھے۔ دونوں کی زندگی کے دھارے الگ الگ تھے لیکن کہیں نہ کہیں آکر مل بھی جاتے تھے۔

بی اسلام النساء کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں جو چاہیں کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اٹھا سکتی تھی، نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے جو بھر دستبردار نہ ہوتی تھیں اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔ خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حالی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حالی کی یہ بات سخت ناگوار گزری (واضح رہے کہ حالی سنی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی رواداری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامل ہوتی تھیں۔) اتفاق سے تانگا الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو

پہنچا ہوا تھا۔ انھوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر برا بھلا کہا کہ نبیؐ کے نواسے پر تو قیامت کا وقت پڑ رہا ہے، اُن کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تمانگا الٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گزری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالیؔ نے صرف اتنا کہا "وہ سیدانی غصّے میں ہے اور حق پر۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے، وہ جو کہتی ہیں بجا ہے۔"

خواجہ سجاد حسین کی بیوی؛ اُن کے ماموں کی بیٹی تھیں اور وہ بھی اپنی پھوپی اور باپ کی طرح تیز مزاج تھیں اور ساس بہو میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ حالیؔ اوپر کے کمرے میں بیٹھے لکھتے ہوتے اور یہ ساری باتیں سنتے مگر ایک لفظ نہ بولتے۔ بیوی کا بہت خیال کرتے تھے اور بہو کو بھی بہت چاہتے تھے، اکثر ان ہی جھگڑوں میں شام ہو جاتی تو وہ اپنا کام ختم کرکے اٹھتے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مسکراتے ہوئے شیریں لہجے میں جھک کر کہتے "بس بی بس...... اب تو شام بھی ہو گئی۔ اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا جسے پانی پت میں تغاری کہتے تھے) کے نیچے دبا دو۔ اس وقت تو بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں۔"

حالیؔ نجی خطوں میں اکثر اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ان کا کس قدر پاس تھا بیٹوں، بھتیجوں، پوتیوں وغیرہ کو ان کی طرف سے خاص طور پر سلام و پیام، دعا پیار اور اُن کی صحت کا حال لکھتے اور اُن کو باقاعدہ خط لکھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح اُن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اُن کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے بدلے میں حالیؔ اور خواجہ سجاد حسین ایک دکان لینا چاہتے تھے۔ مگر یہ تجویز مولانا کی بیوی کو پسند نہ تھی۔ اس بارے میں انھوں نے کئی خطوں میں بیٹے کو لکھا کہ بغیر ان کی مرضی کے دکان نہیں لینی چاہیے۔ "اگرچہ مناسب تو یہی تھا مگر مستورات کی بغیر مرضی کے تبادلہ نہیں ہو سکتا، خصوصاً تمھاری والدہ اس کے بہت خلاف ہیں۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "تمھاری والدہ اب اچھی ہیں اور کمزوری کے باوجود گھر کا سارا کام کاج کیے جاتی ہیں۔"

تمھاری والدہ نے باوجود کمزوری کے سب روزے رکھے اور باوجود اس کے سارا کام اگلے

اور پچھلے کو خود کرتی رہیں۔"

شادی بیاہ، نسبت ناتے اور ہر قسم کے اہم کام جو اولاد اور اولاد کی اولاد سے متعلق ہوتے، اُن میں حالیؔ کی رائے سے زیادہ ان کی بیوی کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ حالیؔ کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتے اور پھر اس کے بارے میں الٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ ان کے ذاتی خرچ کے لیے زیادہ تر خواجہ سجاد حسین اُن کو کچھ روپے بھیج دیتے تھے۔

اُن کے انتقال پر مولانا حالیؔ نے خواجہ سجاد حسین کو جو اطلاعی اور تعزیتی خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی بیوی کی کتنی قدر تھی۔

"پرسوں تمھاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا (ہیضے کا) اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگرچہ اس حادثۂ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے اُس کا بیان کرنا مشکل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمھاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اُس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضلہ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثنا خواں اور شکر گزار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔ انھوں نے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ آخر وقت میں جب تک اُن کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد اُن کے وردِ زبان رہی۔ جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اُس سے زیادہ کون خوش نصیب ہو سکتا ہے۔"

حالیؔ کا ضبط دیکھیے کہ ذکر محض مرحومہ کی خوبیوں کا ہے۔ اپنے رنج و غم کے بارے میں ایک حرف نہیں۔ پھر بھی اُس کے ایک ایک لفظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالیؔ کی بی بی کیسی اعلیٰ سیرت کی مالک تھیں اور حالیؔ کے دل میں اُن کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ حالیؔ کو بیٹوں کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سخت رنجیدہ ہیں تو کس طرح صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ "تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ

کی محبت اور خوبیوں کو بہت مت یاد کیا کرو۔ اور اس دعا کا ورد رکھو "الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ دے" خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج و غم کا بہترین علاج ہے۔"

اس سے کچھ عرصے پہلے اُن کے عزیز دوست اور مرشد سر سید کا جن سے انھیں بہت گہری عقیدت اور محبت تھی انتقال ہو چکا تھا۔ اُن کی وفات کا جیسا سخت صدمہ حالؔی کو ہوا ہوگا اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان کا سب سے بڑا دوست، مرشد اور ساتھی، سب سے بڑا قدرداں چل بسا۔ اس کا جتنا صدمہ انھیں ہوتا تھوڑا تھا۔ سر سید سے حالؔی کو جو محبت اور عقیدت تھی وہ تو ان کی تصانیف اور اشعار اور خطوط سے ظاہر ہی ہے لیکن خود سر سید کو بھی اُن سے بڑی محبت تھی اور وہ اُن کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے حالؔی کے بارے میں کہا تھا "ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانے میں جب کہا جاوے گا کہ فخرِ قوم، فخرِ شعراء، فخرِ علما اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور اُن سے نجات دلانے والا قوم کا کون ہے تو کہا جاوے گا کہ حالؔی۔۔۔۔"

ایک اور موقعے پر حالؔی کی ایک نظم کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تقریر میں یوں اُن کی خدمات کی تعریف کی: "مولانا حالؔی اردو زبان کی شاعری میں انسان کو انسان دکھانے اور اُس کے اندرونی اور قدرتی جذبات کا لفظوں میں نقشہ کھینچ دینے سے فن شاعری کے مجدّد ہوئے، اگر قوم زندہ ہوتی تو جس طرح قوم نے (نہ کسی بادشاہ نے) اہل کمال کو قومی خطاب علامہ اور حکیم اور فیلسوف اور شمس الائمہ وغیرہ دیے ہیں؛ مولانا حالؔی کو بھی کوئی خطاب دیتی۔ مگر افسوس کہ قوم زندہ نہیں۔ اس کے سوا ایک مشکل یہ ہے کہ مولانا حالؔی خود ہی مجدّد ہیں اور خود ہی مکمل اور متمم ہیں اور افسوس کہ خود ہی خاتم ہیں پھر ان کو کوئی کس کس خطاب سے یاد۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

ایک خط میں سر سید کس محبت سے حالؔی کو لکھتے ہیں:۔

"شملے میں میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے کہ چند روز آپ کی صحبت رہے میرا رمضان سچ مچ عید ہو جاوے گا۔ آپ بلا تامل تشریف لائیں۔ مکان، دل، آنکھیں سب حاضر ہیں۔"

مگر ایسے دوست کی موت بھی انھیں زندگی سے بیزار نہ کر سکی بلکہ وہ اور زیادہ لگن اور محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگ گئے تاکہ وہ دنیا کو دکھائیں کہ اس بے مثل انسان نے کس طرح قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے میں اپنی زندگی صرف کی اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کا ایثار خوشی کے ساتھ گوارا کیا۔ ۱۹۰۱ء میں تقریباً ہزار صفحے کی ضخیم کتاب حیاتِ جاوید تیار ہو گئی جس نے ایک طرف سر سید کے کام کو جاودانی بنایا اور دوسری طرف اس خاص شعبۂ ادب میں حالؔی کے نام کو امر بنا دیا۔

حالؔی طبعاً گوشہ نشین اور تنہائی پسند تھے۔ نام، نمود اور شہرت سے گھبراتے تھے پھر بھی اُن کی علمی اور ادبی خدمات اس قدر اہمیت رکھتی تھیں کہ سارا ملک اُن کا معترف اور مداح تھا۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت نے بغیر کسی تحریک یا کوشش کے اُن کی قابلِ قدر خدمات کے اعزاز میں شمس العلما کا خطاب پیش کیا جو اُس وقت واقعتاً بڑے بڑے عالم فاضل لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس پر تمام علمی و ادبی حلقوں میں خوشی منائی گئی اور مولانا کے پاس سارے ملک سے سیکڑوں مبارک باد کے خط آئے۔ اُن میں مولانا شبلؔی کا خط سب سے مختصر ہے۔ مگر اُنھوں نے ایک ہی جملے میں اپنی پوری عقیدت اور احترام کا اظہار کر دیا ہے: "مولانا! آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلمائی کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی!"

اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا شبلؔی اکثر مولانا حالؔی پر اعتراض بھی کرتے تھے۔ حیاتِ جاوید پر اُنھوں نے خاص طور پر سخت تنقید اور اعتراض کیے تھے اور اُسے سر سیدؔ کی "مدلل مداحی" قرار دیا تھا۔ لیکن اس میں دیانت دارانہ اختلاف رائے اور ادبی چشمک دونوں کو دخل تھا جس کا عالی ظرف حالؔی نے کبھی خیال نہیں کیا۔ اور شبلؔی بھی اس چشمک کے باوجود حالؔی کی سیرت اور شخصیت سے بہت متاثر اور اُن کے بڑے مداح تھے۔

حالؔی کو خطاب ملا تو انھیں بجائے خوشی کے الجھن سی محسوس ہوئی۔ اُس زمانے کا دستور تھا کہ جس شخص کو گورنمنٹ خطاب سے "سرفراز" کرتی تھی اسے ہر دربار اور دوسری سرکاری تقریبوں میں حاضری دینی اور حکام کی پذیرائی کرنی پڑتی تھی۔ حالؔی ان چیزوں سے گھبراتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں۔
اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے

ہیں اور اس کے لیے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہیں ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا، لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ . . . . . . بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟"

۱۹۰۵ء میں نظام حیدرآباد کی چہل سالہ سال گرہ کے جشن میں مولانا حالیؔ کو بلایا گیا۔ حالیؔ باوجود پیرانہ سالی اور ضعیفی کے وہاں گئے اور چھ مہینے تک وہاں قیام کیا۔ اس زمانے میں اُن کی وہاں کے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔ یہ حالیؔ کی سیرت کی خصوصیت تھی کہ جو ایک مرتبہ ان سے مل لیتا تھا ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو جاتا تھا۔ جب مولانا وہاں سے واپس آنے لگے تو اہل حیدرآباد نے ایک سپاس نامہ ان کی خدمت میں پیش کیا، جس میں انھوں نے اپنی دلی عقیدت اور ارادت کا اظہار کیا تھا۔ یہ سپاس نامہ ریشم پر چھپا ہوا ہے اور حسنِ اتفاق سے میرے پاس موجود ہے۔ اس کے چند جملوں سے اندازہ ہوگا کہ حالیؔ کی شخصیت نے جو ہر قسم کی شہرت اور "اشتہار بازی" سے پرہیز کرتی تھی، لوگوں پر کیا اثر پیدا کیا تھا:

"اہل حیدرآباد کے لیے یہ کچھ کم باعثِ فخر و عزت نہیں کہ آپ جیسا فاضل صاحب دل اور ہمدردِ بنی نوعِ انسان اس شہر میں آئے، چندے قیام کرے اور لوگوں کو اپنی صحبت سے مستفیض کرے۔ آپ کے احسانات ہمارے ملک اور قوم پر ایسے نہیں کہ وہ ہمارے شکریے کے محتاج ہوں۔ بلکہ وہ ہم پر ایسے چھائے ہوئے ہیں کہ اُن کے شکریے سے عہدہ برآ ہونا ہماری طاقت سے باہر ہے . . . . . . اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ سر سیّد کے مشن کو آپ سے زیادہ کسی سے مدد نہیں ملی۔ آپ زیادہ تر ہمارے شکریے کے اس لیے بھی مستحق ہیں کہ جب سے آپ نے قلم اُٹھایا کبھی کوئی تصنیف اپنی ذاتی منفعت کے لیے نہیں کی محض ملک کی بہبودی اور فلاح کے لیے . . . . . . اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ آپ نے ہمیشہ ایسے مضمون پر قلم اُٹھایا جس کا اثر فائدہ اور دلچسپی لازوال ہے۔ "مجالس النسا" سے لے کر "حیاتِ جاوید" تک اور "مسدس حالیؔ" سے لے کر "چپ کی داد" تک آپ کی کل تصانیف حبِّ وطن اور فلاحِ قوم سے بھری ہوئی ہیں۔

"آپ نے ملک کی تمدنی اور اخلاقی حالت پر وقتاً فوقتاً جو پُر درد نظمیں اور نثریں لکھی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ملک کے حالات کو کیسی غائر نظر سے دیکھا ہے۔ اور اس کی فلاح و بہبود کا کس قدر خیال ہے . . . . . . خاص کر آپ نے بے زبان فرقۂ نسواں کی چپ کی جو داد دی ہے وہ نہایت قابلِ تحسین اور لائق شکر ہے۔ آپ کی درد انگیز اور دل کو ہلا دینے والی مثنوی "مناجاتِ بیوہ" اور آخری نظم "چپ کی داد" ہمارے قول کی شاہد ہیں۔

"علمی اور دماغی قابلیتوں کے علاوہ ہم آپ میں ایک اور بے بہا خوبی پاتے ہیں۔ جس کا ذکر اس موقعے پر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ آپ کا وسیع اخلاق اور صلحِ کل مشرب ہے۔ آپ کی تمام تصانیف میں کہیں تعصب کی بو نہیں پائی جاتی . . . . آپ نے سب فرقوں اور سب مذہبوں اور سب طبقوں کو ایک نظر سے دیکھا ہے۔ خوش اخلاقی اور بے تعصبی کے سوائے آپ میں سچی انسانی ہمدردی، انکسار، محبت اور ایثار ایسی خوبیاں ہیں جو خدا اپنے برگزیدہ لوگوں اور خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ اس کا جو پاک اثر اوروں پر پڑتا ہے وہ ہزار ہا داخلی کتب کے مطالعے سے بڑھ کر ہے . . ."

مولانا حالیؔ چھ مہینے حیدرآباد میں گزار کر واپس آگئے لیکن حیدرآباد والوں کی محبت اُن کے دل میں باقی رہی۔ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد میں سخت سیلاب آیا جس نے ہزاروں گھر تباہ کر دیے۔ حالیؔ نے جب یہ خبر سنی تو بے قرار ہوگئے۔ اس زمانے کے خطوں میں اپنے نوجوان دوست عبدالحق (ڈاکٹر مولوی عبدالحق) سے نام بنام ایک ایک دوست اور اپنے ایک ایک جاننے والے کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ مصیبت زدوں کی تکلیف کے خیال سے خود اُن کے دل میں رنج و درد کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔

پانی پت ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ جس میں نہ نئی طرز کے انگریزی اسکول تھے اور نہ کوئی لائبریری جس سے اہلِ علم و ذوق حسبِ ضرورت کتابیں نکلوا کر پڑھ سکیں۔ مولانا حالیؔ نے اس کمی کو محسوس کیا اور ۱۹۰۵ء میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے موقعے پر اُن کی یادگار کو بہانہ بنا کر شہر کے لوگوں سے چندہ جمع کیا۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس روپے سے اسکول کھولا جائے مگر چندہ بہت کم یعنی صرف دو ہزار ہو سکا۔ جس میں کسی اسکول کا قیام ممکن نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اس سے ایک لائبریری قائم کی اور پانی پت

کے وسط میں ایک پر فضا ٹیلے کے اوپر یہ لائبریری بنائی اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں منگا کر اُس میں جمع کیں۔ ۱۹۴۷ء تک یہ لائبریری قائم تھی۔ اب خدا جانے باقی ہے یا زمانے کی گردش نے اُسے بھی تباہ کر دیا۔

اسکول قائم کرنے کی تمنا اس وقت تو پوری نہ ہو سکی۔ مگر چند سال بعد خواجہ سجاد حسین کی کوشش سے ایک چھوٹا سا لڑکوں کا اسکول قائم ہو گیا تھا جو بعد میں ہائی اسکول تک ترقی کر گیا تھا اور حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۹۴۷ء کی قیامت میں حالی کی یہ یادگار بھی تعصب و فساد کی نذر ہو گئی۔

مولانا حالی کی آنکھیں عرصے سے کمزور ہوتی جا رہی تھیں مگر کام کی کثرت اتنا موقع نہ دیتی تھی کہ علاج کی طرف توجہ کریں۔ حیدر آباد سے واپس آنے کے تھوڑے دن بعد ہی اُن کی داہنی آنکھ میں پانی اُتر آیا اور اس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا کام بالکل رک گیا۔ مولانا کی پوتی مشتاق فاطمہ (اہلیہ غلام الثقلین) اور اُن کے دیور خواجہ غلام السبطین جو مولانا کے نواسے ہوتے تھے بہت اصرار کر رہے تھے کہ مولانا اُن کے پاس لکھنؤ آ کر آنکھ بنوائیں لیکن حالی کو اس میں بہت تامل تھا اس لیے کہ پوتی کو بہت چاہتے تھے اور اُن کی خلقی کمزوری کی وجہ سے انھیں تکلیف دینے کے خیال سے وہاں جا کر نہیں رہے کہ ان پر بیماری، تیمار داری اور مہمان داری کا بوجھ نہ پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی وجہ سے دوسروں کو بہت کم تکلیف دیتے تھے خواہ وہ اُن کی اولاد ہی کیوں نہ ہو اور اس کے برعکس خود دوسروں کے لیے ہر طرح کی تکلیف و زحمت بڑی خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ غرض بہت دن اسی سوچ بچار اور الجھن میں گزرے۔ اس اثنا میں دوسری آنکھ کی روشنی بھی کم ہونی شروع ہو گئی۔ آخر پٹیالہ کے راجندر ہاسپٹل میں آنکھ کا آپریشن کرایا گیا۔ اس زمانے میں "حیاتِ جاوید" کے شائع کرانے میں مولانا بہت زیر بار ہو چکے تھے۔ اب آنکھ کے آپریشن میں ساڑھے تین سو روپے اور خرچ ہو گئے اور اس کی وجہ سے ان کی مالی مشکلات بڑھ گئیں۔ آپریشن سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ معمولی طور پر لکھنے پڑھنے لگے مگر آنکھ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد دوسری آنکھ میں پانی اتر آیا، اور مئی ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ جا کر دوسری آنکھ کا آپریشن کرانا پڑا اور اس کے بعد عینک کی مدد سے کام چلتا رہا۔

دسمبر ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اور مولانا حالی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ حالی طبعاً اس قدر منکسر مزاج واقع ہوئے تھے کہ اس خبر کو سُن کر اُن کو تعجب ہوا۔ زرا اس انکسار اور سادگی کو دیکھیے گا۔ خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں: "لوکل کمیٹی کراچی اور سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی علی گڑھ نے غلطی سے اجلاس کراچی میں مجھے پریسیڈنٹ بنانا تجویز کیا ہے۔ ہر چند عذرات کیے گئے مگر مجھے اس قدر مجبور کیا کہ انکار کرنے کا محل باقی نہ رہا ......" چنانچہ ۲۱ دسمبر ۱۹۰۷ء کو مولانا حالی نے ۷۳ برس کی عمر میں کراچی کا طول طویل سفر کیا۔ اُن کے ساتھ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السبطین، نواب وقار الملک، میجر سید حسن وغیرہ کل تقریباً سولہ سترہ آدمی اور تھے۔ ۲۳ کو رات کے وقت کراچی پہنچے۔ کانفرنس میں مولانا حالی نے جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ بڑا پُرخلوص اور اثر آفریں تھا۔ اس میں انھوں نے قوم کو ہر قسم کے علوم و فنون حاصل کرنے کی ترغیب دی اور سودیشی کی تحریک کی اہمیت بھی بتائی تھی:

"بہر حال مسلمانوں کی قومی ترقی کے لیے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تعلیم کے ہر شعبے میں دست گاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں جس میں اُن کے ہم وطن اُن سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ اُن کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑے گا ......" اس کے بعد کہا:-

"صاحبو ...... صنعت و حرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ جب سے سودیشی کی تحریک شروع ہوئی ہے ہمارے ہم وطن اُس کی طرف اور بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس ملک کی مالی مشکلات جس میں وہ اکثر مبتلا رہتا ہے اُن سے اس کا نجات پانا محض صنعت و حرفت کی ترقی پر منحصر ہے ...... اگرچہ مسلمان بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ اب تک اس سے بالکل الگ رہے ہیں اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنی تمام ہم وطن قوموں سے پیچھے رہ گئے اور اب کسی طرح ان کی برابری نہیں کر سکتے اسی طرح صنعت و حرفت سے بھی اس

وقت اُن کی غفلت کا انجام وہی نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کتنی صحیح پیشین گوئی تھی! حالؔی کا اندیشہ ٹھیک نکلا اور اُن کے ہم قوموں کی اکثریت نے صنعت و حرفت کی طرف توجہ دی، نہ سودیشی تحریک کو پوری طرح اپنایا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ملک میں اقتصادی لحاظ سے بہت پس ماندہ اور مجبور ہیں۔

اس زمانے میں مولانا حالؔی نے ایک آل نامہ لکھنا شروع کیا تھا جو مزاح کا ایک عجیب و غریب اور دلچسپ نمونہ تھا۔ افسوس کہ یہ پورا نہ ہو سکا۔ اس میں ہر مذہب اور فرقے کے تعصب، تنگ نظری، حماقت، جہالت، خود غرضی وغیرہ پر چوٹ کی گئی ہے "مکتوباتِ حالؔی" میں ہمیں اس کے چند لفظ ملے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لفظ	معنیٰ
المذہب	اعلانِ جنگ
الدین	تقلیدِ آباؤ اجداد
العلم	قسمے از جہلِ مرکب
الامتحان	آزمائشِ لیاقتِ ممتحنان
الیونیورسٹی	کارخانۂ کلرک سازی
المسلمانانِ ہند	چوں مارگزیدہ از ریسماں ترسندگان
الرئیس	آں کہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر	آں کہ تہیدست و قرضدار باشد
المولوی	آں کہ مسلمانان را از دائرۂ اسلام خارج می کردہ باشد۔
الواعظ	آں کہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند
الشکار	بہانۂ آدم کشی

افسوس ہے کہ یہ مکمل نہ ہو سکا ورنہ اپنے طرز کی لاجواب طنزیہ چیز ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس عمر میں بھی حالؔی کی ذہنی جودت اور دقتِ نظر پوری طرح کار فرما تھی۔

مولانا حالؔی کی بڑی خواہش تھی کہ کم سے کم انھیں زندگی کے اس آخری زمانے میں سکون و اطمینان میسر آجائے تاکہ جو کام اُن کے ذہن میں ہیں انھیں انجام دے سکیں۔ وہ اپنا عربی و فارسی کلام مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کر کے اُس کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا اُن کا خیال تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی خواہش تھی کہ اردو میں اعلیٰ درجے کے ڈرامے اور ناول لکھے جائیں اور دوسری زبانوں کے بلند پایہ ناول اور ڈرامے ترجمہ کیے جائیں جو اردو میں نمونے کا کام دے سکیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُن کا جی چاہتا ہے کہ کوئی ڈراما لکھیں۔ غرض بہت سے مفید کام اُن کے ذہن میں موجود تھے۔ لیکن بڑھاپا، بیماری، کمزوری اور خانگی تفکرات اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ اطمینان سے کام کر سکیں۔

غالباً ۱۹۱۱ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے انھیں اورنگ آباد بہت اصرار سے بلایا کہ یہاں کا موسم خوشگوار ہے، آب و ہوا معتدل ہے، پانی لطیف ہے اور یہ بہت پُر فضا مقام ہے۔ آپ یہاں آئیے۔ آپ کی صحت کو بھی فائدہ ہوگا۔ اور اطمینان سے کام کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ مولانا حالؔی کا خود جی وہاں جانے کو چاہتا تھا اور وہ تیار بھی ہو گئے لیکن اس ضعیفی اور کمزوری کی حالت میں اعزا کسی طرح اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ وہ اتنا دور دراز کا سفر کریں۔ مولوی صاحب کو کس انداز سے لکھتے ہیں۔

"الحمد للہ آپ اورنگ آباد میں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں آکر رہوں مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور دراز کی مسافت پر کسی دوست کے پاس جا کر رہنا یا تو اس کو بیمار داری کی تکلیف دینی ہے یا اس پر تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کچھ عرصے بعد مولوی عبدالحق نے اپنے آنے کے متعلق لکھا۔ اس پر حالؔی کس لطیف پیرائے میں اپنی زندگی سے مایوسی کا ذکر کرتے ہیں:

"آپ نے بہت جلد تشریف لانے کا وعدہ کیا ہے۔ مگر میں اپنی حالت کے لحاظ سے کسی کا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

خدا ہی جانے سحر ہو، نہ ہو، جئیں نہ جئیں
شبِ فراق کئی احتمال رکھتی ہے

میں اپنی طرف سے تو اس وقت تک زندہ رہنے کے لیے بہت کوشش کروں گا۔" لیکن اس انداز بیان ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کسی خوش مذاق ادیب اور شاعر کا خط ہے۔ کسی زندگی سے مایوس بیمار بوڑھے کا نہیں۔

اس سکون کی تلاش میں ایک مرتبہ کچھ عرصے کے لیے وہ فرید آباد میں اپنے ہم وطن ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب کے ہاں جا کر بھی رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء سے دسمبر ۱۲ء تک۔ وہیں انھوں نے اپنے عربی فارسی کلام کو مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ جو اُن کے انتقال کے بعد چھپ کر آیا۔ وہاں سے خواجہ تصدق حسین کو ۱۷ر مئی ۱۹۱۳ء کو یعنی وفات سے ڈیڑھ سال پہلے ایک خط میں لکھتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب انھیں اپنے زیادہ دن زندہ رہنے کی امید نہ تھی اور جو کام باقی تھے وہ جلد از جلد باوجود ضعیفی، بیماری اور کمزوری کے کر ڈالنا چاہتے تھے۔ "عمر کے دن ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اور کوئی کام ضروری وغیر ضروری سرانجام نہیں دے سکتا۔ سب سے ضروری کام اس وقت یہ تھا کہ دنیا کے تمام تعلقات قطع کر کے جو چند انفاس زندگی کے باقی ہیں ان میں خدا کی یاد کی جائے مگر اپنے کلام کا چھپوانا میرے حق میں شیطانی وسوسہ ہو گیا ہے۔ ہرگز طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ جو کلام اب تک شائع نہیں ہوا اور جس کے چھپوانے اور شائع کرنے کی میرے بعد کسی سے امید نہیں ہے اس کو یونہی چھوڑ کر چلا جاؤں۔"

فرید آباد ہی کے قیام میں انھوں نے اپنے عربی، فارسی کلام اور نثر کو ترتیب دیا اور اس کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔ اُن کے سامنے ہی غالباً وہ چھپنے بھی چلا گیا تھا مگر وہ کتابی شکل میں شائع مولانا کے انتقال کے بعد ہوا۔

فرید آباد میں بھی انھیں اطمینان سے کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ وہاں بھی لوگ دن رات ملنے آیا کرتے تھے اور اُن کا بیشتر وقت اُن لوگوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ حالؔی کی صحت نوجوانی ہی سے خراب تھی۔ غدر کے زمانے کی صعوبات نے انھیں کمزور کر دیا تھا اور یہ اثر ساری عمر باقی رہا۔ متعدد مرض اُن کو لاحق رہتے تھے۔ نزلہ زکام تو عمر بھر ساتھی رہا۔ دمے اور انفلوانزا وغیرہ کی اکثر شکایت ہو جاتی تھی۔ بواسیر کا بھی مرض تھا۔ آخر میں بینائی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ دانتوں میں تکلیف رہنے لگی تھی اور اعصاب پر بھی بہت

اثر تھا۔ اُن کے بیشتر خطوں میں اپنی بیماری اور کمزوری کا ذکر ملتا ہے۔ مگر یہ ذکر ہمیشہ ضمناً ہوتا ہے اور بہت سرسری انداز میں صحت کا حال بتا کر آگے بڑھ جاتے ہیں گویا یہ کوئی قابلِ اعتنا چیز نہیں۔ صحت جیسی دولت کھونے کا انھیں افسوس ضرور تھا۔ اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کی بیماری کی خبر سن کر ان کو ایک بار لکھا۔

"میں نے اپنی غفلت اور بے پروائی سے ان امراض کو بڑھا لیا۔ کبھی باقاعدہ علاج نہیں کیا، فصدیں متواتر کھلوا کر خون کی مقدار کم کر لی۔ غذا وغیرہ کا زیادہ اہتمام نہیں کیا۔ مگر تم کو مجھ سے عبرت اور نصیحت لینی چاہیے۔ تمام دنیا اور دین کی خوبیاں صحتِ جسمانی سے آراستہ ہیں۔ جس کی صحت اچھی نہیں اس کا عدم اور وجود برابر ہے ......" غالباً نوجوانی میں وہ اپنی صحت کی طرف سے لاپروا رہے ہوں گے ورنہ آخر عمر میں تو وہ صحت کے عام اصولوں کو برتتے تھے اور بااصول، محتاط اور معتدل زندگی تو ان کی شروع ہی سے رہی تھی۔ صحت قائم رکھنے کے چند اصول بیٹے کو بتاتے ہیں "غذا ہلکی اور سریع الہضم کھایا کرو۔ اور تھوڑی تھوڑی تین چار دفعہ کر کے کھاؤ اور بالالتزام دو تین میل ٹھنڈے وقت پھرا کرو۔ اور پانی فلٹر کیا ہوا پیو ...." اسی بااصول اور محتاط زندگی کا کرشمہ تھا کہ باوجود اس قدر دائم المرض اور کمزور ہونے کے انھوں نے تقریباً اسّی سال کی عمر پائی اور وفات سے چند ماہ پیشتر تک ٹھوس علمی، ادبی خدمات انجام دیتے رہے، سفر کرتے رہے، خاندانی معاملات سلجھاتے رہے۔ روزے رکھتے رہے اور حقوق اللہ اور حقوقِ عباد میں سے کسی کو بھی انھوں نے نہیں چھوڑا۔ اُن کی قوتِ ارادی اور حوصلے نے کبھی بیماری کو اُن پر مسلط نہیں ہونے دیا بلکہ وہ خود بیماری کو مغلوب کرتے رہے۔

انتقال کے کچھ مہینے پہلے مولانا حالؔی کے دماغ کے اعصاب پر کچھ ایسا اثر ہو گیا تھا کہ وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ادراک کی چمک نظر آتی لیکن جب تک جواب دماغ سے زبان تک آئے اعصاب جواب دے دیتے اور مسکراہٹ بے بسی میں بدل جاتی تھی۔

مگر اس میں دماغ کا بھی کیا قصور تھا؟ چار سال کی عمر سے اسّی سال تک تقریباً پچھتّر سال جو دماغ دن رات کام کرتا رہا ہو، جس نے ساری عمر طلبِ علم میں بسر کی ہو اور ساٹھ سال تک ٹھوس

علمی کام کرتا رہا ہو، جس نے ستر سال تک ہر قسم کی فکریں، پریشانیاں، رنج و مصائب خاموشی سے جھیلے ہوں، اس کا اتنے عرصے تک کام کرتے رہنا حیرت کی بات ہے نہ کہ چند مہینے کے لیے بیکار ہو جانا۔ میری والدہ مشتاق فاطمہ سنایا کرتی تھیں کہ "ایک دفعہ بچپن میں ہم نے یہ سنا کہ انگریز مولانا حالیؔ کا دماغ خرید لیں گے اور ان کے انتقال کے بعد اس کا آپریشن کرکے دیکھیں گے کہ اس میں کیا خاص بات ہے جس کی وجہ سے انھوں نے ایسے بڑے بڑے کام انجام دیے" (اس قسم کی باتیں سرسیّد کے دماغ کے بارے میں بھی مشہور تھیں) وہ فرمایا کرتی تھیں کہ یہ سن کر بہت روئے تو "دادا باجی نے ہنس کر ہمیں سمجھایا اور کہا کہ ایسا ہوتا بھی تو یہ رونے کی نہیں خوش ہونے کی بات تھی۔"

ظاہر ہے کہ یہ لوگوں کے اپنے جذبات اور خیالات تھے اور وہ حیرت جو انھیں حالیؔ اور سرسیّد جیسے دماغوں کو دیکھ کر ہوتی تھی اُسے انگریزوں کی طرف منسوب کرکے ظاہر کرتے تھے۔

آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو علم و اُدب کا یہ گوہرِ گراں مایہ، جس نے اردو میں جدید شاعری کی بنا ڈالی اور تنقید میں امامت کا مقام حاصل کیا، جس نے اپنی مسدّس میں ایک قوم کے عروج و زوال کی داستان کو امر بنا دیا، جس کا دماغ بلند اور دل دُردمند تھا، اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا اور اپنے جان آفریں کے پاس پہنچ کر مقامِ محمود حاصل کیا۔

پانی پت میں درگاہِ قلندر صاحبؒ کے صحن میں مسجد کے حوض کے کنارے، سنگِ مرمر کی ایک خوب صورت قبر میں حالیؔ آسودۂ خواب ہیں۔ یہ مقام شعر و اُدب کے قدر دانوں کے لیے ہمیشہ آستانۂ نیاز بنا رہے گا۔

آب و رنگ

بچپن ہی سے حالیؔ میں وہ ذہنی بیداری نظر آتی تھی جسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ یہ بچّہ دنیا میں کچھ ہو کر رہے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔" چار سال کی عمر میں جب انھیں پڑھنے بٹھایا گیا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق سب سے پہلے قرآن شریف شروع کرایا گیا تو انھوں نے تھوڑے ہی دن میں پورا قرآنِ کریم حفظ کر ڈالا اور تعلیم کی اس منزل کو اور بچوں سے بہت پہلے طے کر لیا۔ اس کے بعد ایک مدّت تک انھیں باقاعدہ تعلیم نہیں مل سکی مگر انھوں نے اپنے شوق کو نہیں چھوڑا۔ اور کوئی ہوتا تو چھوٹی سی عمر میں شادی ہو جانے سے اُس کی تعلیم بالکل رک جاتی مگر حالیؔ ان رکاوٹوں کو کب مانتے تھے۔ انھوں نے گھر بار چھوڑا، وطن چھوڑا، چھپ کر دلّی چلے آئے اور یہاں طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ بیچ بیچ میں کئی مرتبہ پڑھنے کا سلسلہ چھوڑنا پڑا مگر دراصل یہ سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پایا۔ جب کوئی پڑھانے والا نہ ملتا تو لغت کی مدد سے خود ہی پڑھ لیا کرتے۔ اس سچّی علمی لگن کا یہ نتیجہ ہوا کہ باقاعدہ تعلیم نہ پا سکنے کے باوجود وہ عربی، فارسی، اردو ادب کے ماہر اور قرآنِ پاک اور تفسیر کے عالم بن گئے، فقہ، حدیث، منطق وغیرہ سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی اور شاعری، انشا پردازی کے میدان میں تو وہ جوہر دکھائے کہ اُن کے نام کو بقائے دوام حاصل ہو گئی۔ گو وہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی درسی تعلیم سے محروم رہے مگر اپنی لاہور کی چند سالہ ملازمت میں جب وہ مغربی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے درست کیا کرتے تھے، وہ کچھ حاصل کر لیا جو

دوسرے لوگ اکثر اپنی آدھی عمر اسکول اور کالج میں صرف کرنے کے بعد بھی نہیں سیکھ سکتے۔ چار سال کی عمر میں حالیؔ نے طلبِ علم کی راہ میں قدم رکھا تھا اور اسّی سال کی عمر تک وہ پورے شوق اور لگن کے ساتھ اس راہ پر گامزن رہے۔ جس سے، جب اور جہاں انھیں فیض حاصل کرنے کا موقع ملا، اُنھوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ ایک سچّے طالبِ علم کی یہی شان ہے۔

لیکن علم حاصل کرنے کے لیے سچّے شوق کے علاوہ ایک اور شرط بھی لازمی ہے، یعنی محنت۔ خوش قسمتی سے یہ صفت بھی حالیؔ میں موجود تھی۔ اوّل دن سے آخری دم تک حالیؔ ایک مزدور کی طرح کام میں لگے رہے۔ ملازمت کے فرائض کے علاوہ مطالعہ، تصنیف و تالیف اور بہت سے متفرق کاموں کو جو انھوں نے اپنے ذمّے لے رکھے تھے، صحت اور بیماری، طاقت اور کمزوری ہر حالت میں بڑی پابندی اور محنت سے انجام دیتے تھے۔ کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ ہوتا تو پہلے اس کی پوری تیاری کرتے۔ اس کے لیے مسالا فراہم کرنے میں اپنی جان لڑاتے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "عربی کا ایک قول ہے کہ۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کتنے دنوں میں ہوا، البتہ یہ سب دیکھتے ہیں کہ کیسا ہوا۔" اُن کا اصول تھا کہ جو کام کیا جائے پوری توجّہ اور محنت کے ساتھ کیا جائے۔ بڑھاپے اور کمزوری کے زمانے میں اُنھوں نے دو مرتبہ علیگڑھ کالج کے لیے حیدرآباد کا، ایک مرتبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لیے کراچی کا سفر کیا اور اس کے علاوہ دلّی، علی گڑھ، لکھنؤ، پٹیالہ، لاہور اور دوسرے قریب کے شہروں کے تو بے شمار سفر کیے۔ ان کی یہ محنت صرف قومی کام، مطالعے اور تصنیف و تالیف ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنے سبھی فرائض کو جو خدا نے اور سماج نے ان پر عائد کیے تھے بڑی مستعدی اور تن دہی سے کام انجام دیتے تھے۔ اس علم کے سچّے شیدائی کو، جس کی دلی خواہش یہ تھی کہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تحصیلِ علم میں صرف کر دے، اپنے فرائض کا اتنا گہرا احساس تھا کہ اُس نے اپنے خاندان کی کفالت کی خاطر عمرِ عزیز کے تقریباً تیس سال مختلف جگہ کی ملازمتوں میں گزارے۔ جو کام بھی سپرد ہوا خواہ وہ کسی دفتر کی کلرکی ہو یا کسی رئیس کے بچوں کی اتالیقی، ترجموں کی اصلاح ہو یا اسکول کی مدرسی، اُسے پوری توجّہ، محنت اور دیانت کے ساتھ انجام دیا۔ حالانکہ ملازمت سے اُن کی طبیعت کو بالکل لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن جب تک وہ ملازمت کرتے رہے ان فرائض کو پوری ذمّے داری اور حسن و خوبی سے انجام دینا اپنا فرض جانتے تھے۔ ایک عزیز کو

ملازمت کے فرائض کے بارے میں لکھتے ہیں: "اپنے فرائض کو نہایت تندہی اور سرگرمی سے انجام دیا کرو اور کام سیکھنے اور لیاقت بڑھانے میں حد سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے ...... ہر پیشے میں خواہ وہ پیشہ نوکری ہو یا تجارت یا زراعت یا دستکاری، ضرورت ہے کہ انسان اس کے فرائض نہایت سرگرمی سے ادا کرے ورنہ اس میں کامیابی ہونی ناممکن ہے ....."

اس اصول کو انھوں نے خود اپنے ہر کام میں برتا ...... اُن کے دونوں بیٹوں خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین کو بھی اپنے والد کی طرح ملازمت سے رغبت نہ تھی۔ مگر مجبوراً ملازمت کرتے تھے کہ خاندان کی کفالت کر سکیں۔ حالی کو اس کا احساس تھا اور ان سے ہمدردی اور یہ خواہش بھی کہ اُن کو ملازمت کے چکر سے نکالیں لیکن جب تک کوئی صورت نہ نکلے اُن کو بھی یہ نصیحت تھی کہ ذمے داری سے اپنے فرائض کو ادا کرو۔ خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں: "بھائی صاحب اگر نوکری فی الحقیقت کرنی منظور ہے تو چند روز آسائش و آرام کو بالکل بھول جاؤ۔ تحمل، بردباری اور اطاعت و محنت اختیار کرو اور ہمیشہ ترقی یا تبدیلی کی درخواستیں کرنے سے بھی پرہیز کرو......."

۱۸۸۹ء میں جب وہ دہلی عربک اسکول میں ملازم تھے، سوچ رہے تھے کہ ایک سال کی رخصت لے کر دلی میں ایک بڑا مطبع جاری کریں جس میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر کتابوں کی اشاعت ہو اور ایک بلند پایہ میگزین نکالا جائے ...... "میرا ارادہ ہے کہ بشرطِ حیات و بشرطِ صحت رخصت کے زمانے میں کوئی نیا کام شروع کروں۔ اب تک جو منصوبہ ذہن میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ دلی میں ایک بڑا مطبع قائم کیا جائے جس میں ہندوستان کے عمدہ مصنّفوں کی کتابیں چھپوائی جائیں اور قدما کی عربی اور فارسی تصانیف جو اب تک نہیں چھپیں یا بُری طرح چھپی ہیں نہایت حسنِ اہتمام کے ساتھ چھپوائی جائیں اور ایک رسالہ ماہواری بطور میگزین کے شائع کیا جائے جس میں ہندوستانیوں کو یورپ کی ترقیات کی طرف مائل کیا جائے اور ہندوستان کے روز افزوں تنزل سے ان کو آگاہ کیا جائے اور تجارت و صنعت و حرفت کی جہاں تک ہو سکے ترغیب دی جائے ......"

لیکن افسوس کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس بڑے کام کے لیے ہزاروں روپے کی ضرورت تھی جس کا حالی کے یہاں کال تھا۔ چنانچہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

مولانا حالی کا خاندان بہت بڑا تھا اور دل اس سے بھی بڑا۔ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے اور محتاج کی مدد کے لیے وہ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ آمدنی بہت کم تھی مگر قناعت کی انمول دولت سے مالا مال تھے۔ کسی قسم کا لالچ اُنھیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ انھوں نے کبھی اپنے دوستوں کے ذریعے سے کسی بڑی ملازمت کی کوشش نہیں کی۔ اگر مولانا حالی چاہتے تو حیدرآباد میں اُنھیں کوئی بڑی جگہ مل سکتی تھی۔ علیگڑھ کالج میں بڑی آسانی سے پروفیسر ہو سکتے تھے مگر اُنھوں نے کبھی اس کی بھی خواہش نہیں کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ باہر رہ کر وہ علیگڑھ کی جتنی خدمت کر سکتے ہیں ملازم ہونے کے بعد اس آزادی سے نہیں کر سکیں گے۔ اور جب حیدرآباد سے ساٹھ روپے ماہوار (پچھتر سکّہ) حالی کا وظیفہ مقرر ہوا تو اُنھوں نے اینگلو عربک اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ اسی قلیل آمدنی پر قناعت کر کے علمی، ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ حیدرآباد کا وظیفہ تصنیف و تالیف کے شعبے سے دیا گیا تھا۔ حالی کی دیانت داری کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ اس مد سے وظیفہ لیں اور اپنا وقت دوسری ملازمت میں بھی صرف کریں۔

لیکن اُن کے استغنا اور قناعت کی ایک مثال ایسی ہے جس کی نظیر ادب کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اُنھوں نے اپنی تصانیف سے کبھی مالی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ایک آدھ کتاب کے سوا باقی مشہور تصانیف کی رجسٹری نہیں کرائی اور نہ حقِ تصنیف لیا۔ سب تصانیف قوم کے لیے وقف رہیں۔ بیسیوں ناشروں نے اُن کی کتابوں سے ہزاروں روپے کمائے اور کما رہے ہیں لیکن خود مصنف نے ان سے ایک پیسے کا فائدہ نہ اٹھایا۔ اُن کا اصول تھا جو کتاب قوم کی اصلاح کی غرض سے لکھی جائے اسے کسی شخص کی ملکیت نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ قوم کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حالی صرف مسدس ہی کی رجسٹری کرا لیتے تو نہ صرف وہ خود بلکہ ان کی اولاد بھی ایک مدت تک کے لیے کسبِ معاش سے بے فکر ہو جاتی۔ مگر حالی نے اپنی کتابوں کو قوم کے لیے وقف کر کے سچی قناعت کی ایک ایسی مثال چھوڑی جواب دیکھنے میں نہیں آتی۔

قناعت اگرچہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے پھر بھی یہ نایاب جوہر نہیں۔ سچا آرٹسٹ اکثر اس دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ اسے روپے کی ہوس نہیں ہوتی۔ لیکن اسی کے ساتھ اسے شہرت اور عزت کی خواہش بہت شدت کے ساتھ ہوتی ہے۔ خصوصاً شاعر تو اس معاملے میں بہت بدنام ہیں۔

لیکن حیرت ہوتی ہے کہ حالؔی شہرت و نام و نمود کی طلب سے بھی مستغنی تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ شہرت سے گھبراتے تھے اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر خاموش خدمت کرنا اُنھیں پسند تھا۔ حالؔی اس اٹل حقیقت کو پا گئے تھے کہ جسے شہرت و نمود کی چاٹ لگ جائے وہ قوم کی ٹھوس اور سچی خدمت نہیں کر سکتا۔ اور قومی خدمت میں خود غرضی کا کھوٹ شامل ہوا تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ جس رہبر قوم (یا خادم قوم) کو قوم کی خدمت سے زیادہ اس کی فکر رہے گی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے اس کی شہرت کو داغ لگ جائے یا اُس کی ہر دلعزیزی میں کمی آ جائے، اُس کی دنیاوی اور ظاہری عزت کو بٹا لگ جائے، وہ ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھے گا۔ اور مصلحت کو حق پر ترجیح دے گا۔

حالؔی نے تو اپنے لیے کام ہی وہ چنے تھے جن کا انعام بدنامی اور مخالفت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے قدامت پسندی، روایت پرستی، نفرت، تعصب، جہالت اور بے عملی کے بتوں کو توڑنے کا عزم کیا تھا۔ وہ شعر و ادب کے پرانے اور نکمے سانچے توڑ کر نئے سانچے گھڑنا چاہتے تھے۔ ایسا ادب پیدا کرنا چاہتے تھے جو نئے زمانے کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ انھیں قوم کو غفلت کی گہری نیند سے جگانا اور سچی اور کڑوی باتیں سنانے کا صبر آزما اور کٹھن کام انجام دینا اور ساری دنیا سے بیر مول لینا تھا:

کہہ دو جنھیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ — طعنے جھیلو، بُرا سنو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سر دست — گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

حالؔی نے یہ صلہ خوب خوب پایا مگر قومی خدمت سے منہ نہ موڑا۔

بہ قول مولانا محمد علی مرحوم "اگر حیاتِ جاوید اور مسدس حالؔی کا مصنّف شہرت پسند ہوتا اور کسبِ شہرت کرتا تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نام دنیاوی اور مادّی نقطۂ خیال سے بہت بلند ہوتا لیکن اُس نے کبھی بازار میں بِکنا گوارا نہ کیا۔ اور مولانا حالؔی کا یہ امتیازی کیرکٹر تھا جو ہماری قوم میں بہت ہی کم نظر آتا ہے۔"

حالؔی "بازار میں نہیں بِکے" انھوں نے چپ چپاتے زندگی بھر ٹھوس علمی اور ادبی کام کیے۔ چالیس سال تک اُنھوں نے خاموشی سے علیگڑھ کالج کی خدمت کی۔ نہ وہ خطاب کے خواہاں تھے نہ صدارتوں کے آرزومند۔ انتہا یہ ہے کہ انھیں اپنے ادبی کارناموں کی تعریف کی بھی طلب نہ تھی۔ اس دعوے

کے ثبوت میں چند مثالیں پیش کرتی ہوں:

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے اخبار "افسر" میں حالؔی کی نثر کی تعریف کی۔ اُسے پڑھ کر ان کو خط میں لکھتے ہیں: "میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کیے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مگر یہ سچ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہمعصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہو سکتیں بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس کے اسٹائل میں کون سی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کے طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔"

"حیاتِ جاوید" پر مولوی عبدالحق نے ریویو کیا اس پر انھیں لکھتے ہیں: "حیاتِ جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بتقاضائے محبت تصنیف و مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں اُن کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہلِ ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں۔"

آج کل کے زمانے کے ادیبوں اور مصنّفوں کو جن میں سے اکثر "یار فروشی" اور "چھڑک چھڑک کر بیچنے" میں اپنا جواب نہیں رکھتے حالؔی کی اس گراں قدر رائے پر غور کرنا چاہیے کہ جب تک ہم اور ہمارے ذاتی دوست اور مخالف دنیا میں موجود ہیں اس وقت تک ہماری نظم اور نثر پر بالکل صحیح اور بے لاگ رائیں نہیں دی جا سکتیں۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر شاعر اور ادیب اور قومی رہنما جو اپنے زمانے میں ملک میں اِس سرے سے اُس سرے تک مشہور تھے اب اُن کی شہرت کچھ مدھم سی پڑ گئی ہے۔ دنیا انھیں بھولتی جا رہی ہے لیکن نام و نمود سے بھاگنے والے، شہرت و عزت سے مستغنی حالؔی کا نام اب تک اُسی طرح مشہور ہے۔ اس تنہائی پسند خاموش انسان کا ڈنکا اب تک بج رہا ہے۔ کیا درحقیقت جو لوگ شہرت و عزت کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ ان سے دور رہتی ہے اور جو اس کی پروا نہیں کرتے انھیں کو نصیب ہوتی ہے؟

مولانا حالؔی کی طبیعت میں متانت اور سنجیدگی بہت تھی۔ یہاں تک کہ وہ کبھی بلند آواز سے گفتگو بھی نہیں کرتے تھے بلکہ دھیمی اور شیریں آواز میں ٹھہر ٹھہر کر آہستگی سے دل نشیں انداز میں باتیں کیا کرتے۔ کبھی

قہقہہ مار کر یا زور سے نہیں ہنستے تھے۔ اس کے بجائے ہلکی سی دلکش مسکراہٹ اُن کے چہرے کو تابناک بنائے رکھتی۔ کوئی بات کتنی ہی ناگوار گزرے چیخ کر یا غصّے سے اس کا جواب نہیں دیتے تھے اور نہ کبھی کوئی بُرا لفظ اپنے منہ سے نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور میں ایک بڑے عالم فاضل بزرگ جو کسی عربی اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے اُن سے ملنے آئے اور بڑی دیر تک اُن سے کسی بات پر بحث کرتے رہے۔ وہ صاحب اُس وقت شراب پیے ہوئے تھے۔ منہ سے شراب کے بھبکے آرہے تھے اور باتوں میں بھی نشے کا اثر اور جوش تھا۔ مولانا حاؔلی کو اُن کی یہ حالت اور گفتگو بہت ناگوار ہوئی۔ دیر تک تو صبر سے برداشت کیا کیے آخر عاجز آکر اُن کے منہ سے نکل گیا۔ "مولانا آپ ایسی حالت میں یہاں نہ آیا کیجیے۔" کہنے کو تو یہ جملہ کہہ دیا مگر حاؔلی کے نزدیک یہی بہت سخت فقرہ تھا۔ بہت پشیمان ہوئے اور جب وہ رخصت ہوئے تو دور تک اُن کے ساتھ گئے اور غالباً اُن سے بہت معذرت کی۔

اُن کی طبیعت میں حیا کا مادّہ بھی بہت تھا۔ خصوصاً اپنی تعریف سن کر بہت شرماتے تھے۔ مولانا آزاد نے ایک بار مجھے ایک مشاعرے کا واقعہ سنایا جس میں مولانا حاؔلی کی غزل بہت پسند کی گئی اور داغ تک نے ان کی غزل کی بڑی تعریف کی۔ مولانا آزاد نے کسی شخص سے یہ واقعہ سنا جب کچھ دن بعد مولانا حاؔلی سے ملنے گئے تو اس مشاعرے کا ذکر بھی آیا۔ انھوں نے کئی مرتبہ اس مشاعرے کا ذکر چھیڑا اور چاہا کہ مولانا کے منہ سے داغ کی تعریف کے الفاظ سنیں لیکن مولانا حاؔلی ہر مرتبہ "جی ہاں — کیا کہا جائے ......" کہہ کر اس بات کو ٹال گئے اور کوئی دوسرا ذکر چھیڑ دیا اور ہرگز اپنی زبان سے وہ تعریفی جملہ ادا نہ کیا جو مولانا آزاد اُن سے سننا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد حاؔلی کے ذکر پر فرمایا کرتے ہیں: "مولانا حاؔلی سنجیدگی کی مجسّم تصویر تھے۔"

شاعروں کو اپنا کلام سنانے کا جو شوق ہوتا ہے وہ کون نہیں جانتا؟ لیکن حاؔلی اُس سے ہمیشہ کتراتے تھے۔ جب کوئی فرمائش کرتا تو اسے اکثر ٹال جاتے۔ اگر بہت زیادہ اصرار ہوتا تو مجبوراً چند شعر سنا دیتے تھے مولوی عبدالحق صاحب ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حیدرآباد میں سرسیّد کی برسی کا جلسہ تھا جس میں مولانا حاؔلی نے سرسیّد پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون کافی لمبا تھا اور ضعیفی کا زمانہ، پڑھتے پڑھتے گلا خشک ہوگیا، حلق میں کانٹے پڑ گئے لیکن پانی نہیں مانگا۔ جب بعد میں اس کا ذکر آیا، اور مولوی صاحب نے اُن سے کہا کہ وہاں پانی شربت سب کچھ موجود تھا آپ نے کہا ہوتا تو فوراً حاضر کیا جاتا۔ کہا: "اتنے بڑے مجمعے میں

پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔"

اپنی ساری علمی وادبی قابلیت اور بزرگی کے باوجود اپنے کو کبھی کسی سے برتر نہیں سمجھا۔ چھوٹوں بلکہ بچّوں تک سے اُن کا یہی رویّہ تھا۔ اپنے بھتیجے خواجہ تصدّق حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "مجھ کو اپنی رائے پر چنداں وثوق نہیں ہے۔ تم ماشاء اللہ خود سمجھدار اور عاقل ہو اور مجھ سے بہت بہتر اور برتر مشیر اور صلاح کار تم کو بہم پہنچ سکتے ہیں۔" ایک دوست نے "حیاتِ جاوید" میں کسی غلطی کی طرف متوجہ کیا، جواب میں لکھتے ہیں: "یہ کاتب کی غلطی تو ہو نہیں سکتی خود مصنف کی بھول چوک معلوم ہوتی ہے۔ میں آپ کی خاص عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

طبیعت اگرچہ بے حد سنجیدہ پائی تھی لیکن اس کے باوجود مزاج میں شگفتگی تھی۔ صحبت خشک یا بے مزہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ جو لوگ ان کی صحبت سے فیض اٹھاتے وہ اس سے ایک نئی زندگی اور طاقت حاصل کرتے تھے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ نے اُن کی صحبت سے جو کیفیت طاری ہوتی تھی اُسے اس طرح بیان کیا ہے ؎

آتا ہوں پیرِ دیر کی خدمت سے مست میں
اے زاہدو تمھارے لیے کیا دعا کروں

لطیف مزاح بھی مزاج میں موجود تھا۔ ایک جگہ اپنے بارے میں بیٹے کو لکھتے ہیں: "جو شخص شیطان سے زیادہ مشہور ہو اس کے مرنے کو کوئی چھپا نہیں سکتا۔" ایک اور جگہ ایک صاحب کے بارے میں لکھا "ان کا ارادہ ایسا ہوتا ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے۔"

ایک عزیز کو کتاب تحفتاً بھیجتے ہیں لیکن چونکہ بہت سے لوگوں کو یہ کتابیں تحفے میں دی گئی تھیں اس لیے یہ اصول بنا لیا تھا کہ ڈاک خرچ جس کو کتاب بھیجی جائے وہ ادا کرے گا۔ اس کی معذرت کس انداز میں کرتے ہیں: "تمھاری کتاب رکھی ہے .... کتاب ڈاک میں بھیجنے میں پانچ آنے لگتے ہیں۔ مثل مشہور ہے، گنوار بھیلی دے اور گنا نہ دے۔ سو کتاب تو حاضر ہے مگر پانچ آنے محصول کے آپ کو دینے ہوں گے ......"

غیبت اور بدگوئی سے انھیں دلی نفرت تھی۔ اُن کے دیکھنے والوں اور ساری عمر ان کے ساتھ بسر کرنے والوں کا بیان ہے کہ ہم نے کبھی ایک لفظ کسی کی برائی کا حاؔلی کے منہ سے نہیں سُنا۔ وہ عام طور پر لوگوں کی طرف سے نیک خیال اور حُسنِ ظن سے کام لیتے تھے۔ غیبت، بدگوئی، بدگمانی اُن کے نزدیک بہت بڑے

گناہ تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں — بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں — خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمت میں

خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے " مولانا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیانہ خیالات کی رُو سے ایک صاحبِ باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی بُرائی اُن کے منہ سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے ...... "

اُن کی سیرت کی اس خوبی کو سید ہاشمی فریدآبادی نے یوں بیان کیا ہے " مجھے یہ سبق پہلی مرتبہ اُن کی صحبت میں حاصل ہوا کہ اتنے وسیع تعلقات اور واقفیت کے باوجود اگر آدمی چاہے تو اپنی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر گفتگو کو لوگوں کی ہجو بے جا اور مذمّتِ ذات سے خالی رکھ سکتا ہے "

ہمارے دیس میں عام طور پر اہلِ علم اور فن کار لاپروا، بے سلیقہ اور دنیا کے واقعات اور حالات سے بیگانہ محض ہوتے ہیں اور یہ اُن کی خاص صفات سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن حالی باوجود عالم، شاعر اور ادیب ہونے کے ان " صفات " سے آراستہ نہ تھے۔ وہ منتظم، سلیقہ شعار، صفائی پسند اور خوش ذوق انسان تھے۔ اُن کے لباس میں، مکان میں، طرزِ رہائش اور معاشرت ہر چیز میں سادگی اور نفاست، سلیقہ اور صفائی کا خوب صورت امتزاج نظر آتا تھا۔

اُن کا لباس عام طور پر کُرتا، پاجامہ اور اچکن ہوتا تھا۔ زیادہ تر صافہ باندھتے تھے۔ جاڑے میں اچکن پر چوغہ یا روئی کا دگلہ ہوتا تھا اور گلے میں مفلر لپیٹ لیتے تھے۔ کبھی کبھی ایک گول سی ٹوپی بھی پہنا کرتے تھے۔ لباس کی صفائی ستھرائی اور موزونیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین کا فرمانا ہے " جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہنتے اور پسند کرتے تھے۔ لیکن چونکہ سودیشی کے بڑے حامی تھے اس لیے اگر پانی پت کی بنی ہوئی چوتار (باریک کھدر) کا تھان مل جاتا تو اس کے کپڑے بنا کر بہت خوش ہوتے تھے "

کپڑا خریدتے تو بہت دیکھ بھال کر کہ رنگ، ڈیزائن اور قسم سب موزوں ہو۔ پسند غیر معمولی طور پر نفیس تھی۔ حیدرآباد سے خاندان کی عورتوں کے لیے بہت سے اطلس کے تھان لائے تھے، میں نے خاندان کی اکثر بڑی بوڑھیوں کے پاس ان خوب صورت تھانوں کے پاجامے دیکھے ہیں۔ یہ تھان رنگ، وضع اور پائیداری میں لاجواب ہیں۔

خواجہ سجاد حسین کو ایک روئی کی مرزئی کے لیے لکھتے ہیں " اگر روئی کی ایک " فتوحی " جس میں زیادہ روئی ہو بنواتے لاؤ تو مجھے بہت آرام ملے۔ بٹن چھوٹے نہ ہوں، بڑے بڑے ہوں اور فتوحی زیادہ ڈھیل نہ ہو، ابرہ کلپ دار چھینٹ کا نہ ہو اور استر فلالین کا ہو تو بہتر ہے یا اور کوئی نرم کپڑا ہو "

فریدآباد سے لڑکیوں کے لیے مہندی بھیجی تو ساتھ یہ ہدایت بھی تھی کہ " زیادہ دیر نہ لگائیں کیونکہ اس کا رنگ بہت تیز ہوتا ہے۔ اور دیر تک لگی رہے گی تو ہاتھ پاؤں میں بجائے سرخی کے سیاہی آجائے گی "

چائے ناشتے کا سب سامان ہمیشہ قرینے اور قاعدے سے ایک جگہ رکھا رہتا تھا۔ ملازموں کو اچھی چائے بنانے کی ترکیب سکھا دی گئی تھی۔ اور دن میں کئی مرتبہ چائے بنتی تھی۔ حقہ بھی اہتمام کے ساتھ بھرا جاتا تھا ...... ضرورت ہو تو خود اپنے ہاتھ سے بھی بھر لیتے تھے۔ کہیں جاتے تو ضرورت کی سب چیزیں اُن کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ پان اور تمباکو کا بھی شوق تھا اور عمدہ پان اہتمام کے ساتھ منگا کر استعمال کیے جاتے تھے لیکن بعد میں دانتوں کے خیال سے پان کھانا کم کر دیا تھا اور اس کی جگہ افیون کی چھوٹی چھوٹی گولیاں خاص اہتمام سے بنوا کر استعمال کرنے لگے تھے مگر افیون اُس میں بالکل برائے نام ہوتی تھی۔

اپنے نشست کے کمرے میں اٹھنے بیٹھنے کی جگہ، پلنگ، لکھنے کی میز اور کمرے کے دوسرے سامان کی ترتیب اکثر بدلتے رہتے تھے جس کی وجہ صرف موسم کا تغیر ہی نہیں بلکہ جدت پسندی بھی تھی۔

مکان کی تعمیر، آرائش، سجاوٹ، گھر کے دوسرے کاموں میں مشورہ اور رائے دینا، دواؤں کا انتخاب اور اُن کو بنانے اور استعمال کرنے کی ترکیب، چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر قسم کے کاموں کا اُن کو سلیقہ اور مشق تھی۔

موسمی پھل اور ترکاریاں بہت مرغوب تھیں۔ خاص طور پر آم اور خربوزے۔ اور اُن دونوں کی غضب کی پہچان تھی۔ خواجہ سجاد حسین سے ایک مرتبہ کہا " قاضی کے حوض پر فلاں سمت ایک آم والا بیٹھتا ہے اس سے اتنے آم لے آؤ۔ آم زرد رنگ کے ہیں۔ اور ہر آم کے منہ کے پاس ایک سرخ رنگ کا ناخون کا سا نشان تم دیکھو گے۔ اچھی طرح چھانٹ کر ایسے ہی آم لانا "

خربوزوں سے تو بہت ہی شوق تھا اور دور دور سے اچھے خربوزے منگوائے جاتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ " اب کے سال خربوزوں کی طرف سے بالکل ناامیدی ہے۔ نہ دلی میں خربوزے ہوئے ہیں اور نہ

پانی پت میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر شاہ آباد کا خربوزہ کرنال میں آتا ہو تو اس کو منگوا کر اور کھا کر دیکھنا چاہیے۔ اگر اس میں کچھ جان پائی جائے تو یہاں سات سیر اپنے ساتھ لوا لانا۔"

کھانے سے زیادہ ان چیزوں کو دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے اور فصل میں بڑے اہتمام سے عزیزوں اور دوستوں کی آم اور خربوزے کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔

حالیؔ اپنے آس پاس کی چیزوں کو آنکھ کھول کر غور سے دیکھتے تھے۔ اُن کا مشاہدہ بہت باریک اور گہرا تھا۔ خواجہ سجاد حسین کا بیان ہے کہ "والد مرحوم جو مشاہدہ کرتے تھے اس کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ دو تین مرتبہ جامع مسجد، چاوڑی بازار سے گذرتے ہوئے انھوں نے کہا پہلے ہر دس بیس آدمیوں میں سے ایک دو آدمی جسمانی لحاظ سے دیکھنے کے قابل گزرتا تھا اور اب وہی دلی ہے کہ سینکڑوں میں ایک آدمی بھی رو دار نہیں نظر آتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

باوجود اچھی چیزوں کے شوق اور نفاست پسندی کے طرزِ زندگی سادہ تھا اور خرچ کم کرتے تھے۔ کفایت اور انتظام کو ہر بات میں ملحوظ رکھتے۔ اُن کی طبیعت میں اعتدال اور توازن کا جو مادہ تھا اس کی بدولت قلیل آمدنی میں نہ صرف خود سلیقے اور آرام سے رہتے تھے بلکہ اسی میں لین دین، تحفے تحائف، ضرورت مندوں کی مدد، حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی کرتے تھے۔ اُن کے خاندان میں مشہور تھا کہ مولانا کے ہاتھ میں خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ تھوڑی سی رقم میں وہ بڑے سے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم لکھتے ہیں کہ مولانا حالیؔ کے "اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجے کا اعتدال تھا۔"

ساتھ ہی وہ حسنِ اخلاق کا ایک پیکر تھے۔ خوش مزاجی، شیریں زبانی اور مروت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جو دو ایک مرتبہ بھی اُن سے مل لیتا ہمیشہ کے لیے اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ اُن کے بڑے بڑے مخالفین جو اُن کی نظم و نثر پر جا بے جا اعتراض جڑا کرتے تھے۔ اگر ایک بار بھی ان کی صحبت کا لطف اٹھا لیتے تھے تو اُن کے ڈھنگ گر جاتے تھے اور پھر حالیؔ کو برا کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ملنے جلنے والوں، دوستوں اور اہلِ غرض کا ہمیشہ اُن کے پاس تانتا بندھا رہتا تھا۔ صبح اور شام کا وقت تو اسی کے لیے وقف رہتا تھا۔ شہر کے بیسیوں آدمی آتے، بیٹھتے، باتیں کرتے، چائے حقہ پیتے اور مولانا کی صحبت اور گفتگو سے فیض اٹھاتے۔

یوں بھی جس کا جس وقت جی چاہتا چلا آتا اور جو کام کرانا ہوتا کرا لیتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بہت ضروری کام میں مصروف ہیں مگر لوگ آتے، اور فضول وقت ضائع کرنے لگتے۔ لیکن حالیؔ اُن کی دل آزاری کے ڈر سے کبھی خود وہاں سے اٹھ کر نہیں جاتے بلکہ اشارے کنائے سے بھی کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہوتی جس سے لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ان کا بیٹھنا بار گزر رہا ہے۔ سفارشوں کے لیے لوگ بہت ستاتے تھے۔ اُن سے جہاں تک ہو سکتا سفارش کر دیتے تھے لیکن کوشش کرتے تھے کہ صرف ایسے آدمی کی سفارش کریں جو واقعتاً اس کا مستحق بھی ہو۔ اپنی ہر دلعزیزی سے بے جا فائدہ اٹھانا اُن کو پسند نہ تھا۔ اپنے قریبی عزیزوں کی سفارش سے جہاں تک ہو سکتا بچتے تھے۔ اپنے عزیز بھتیجے خواجہ تصدق حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں "شاید تم لوگ یہ خیال کرتے ہو گے کہ مجھے ہندوستان کے اطراف و جوانب میں ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔ اکثر معزز اور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے تعارف ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں پس میں جس کی جہاں کہیں سفارش کروں گا وہ ضرور کامیاب ہو گا۔ لیکن اے عزیزو! یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دنیا دارالمعاوضہ اور دارالمکافات ہے جو شخص کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلے کی توقع پر کرتا ہے۔ میں تمھاری ایک سفارش اس لیے کرتا ہوں کہ مجھے تم سے دس فرمائشیں کرنے کا موقع ملے۔ پس ایک ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح کا عوض متوقع نہ ہو کیوں کر کارگر ہو سکتی ہے۔ جب میں زمانے کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے امرا اس کی خاطر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی ہر جگہ اس کو مل جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارشیں کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلاً التفات نہیں کرتا، یہی حال میرا ہے کہ اگر میں خاص اپنی ذات کے لیے کہیں جا کر کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہوں تو شاید کسی قدر کامیابی ہو جائے لیکن یہ ہرگز امید نہیں کہ میری سفارشوں کی بھی ایسی ہی قدر و پرسش ہو جیسی مجھ کو اپنی قدر و پرسش کی امید ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

ستر برس پہلے حالیؔ نے سفارش کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ آج بھی اسی قدر درست ہیں۔ وہ انسانی سیرت کی باریکیوں اور کمزوریوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے جو نظریہ جہاں کہیں پیش کرتے ہیں وہ اکثر عمومی ہوتا ہے۔ خود انھوں نے اپنے لیے کبھی کسی سے ذرا سی رعایت، مہربانی یا سفارش کی خواہش نہیں کی۔ کسی شخص کا ذرا سا احسان اٹھانا بھی اُن کو گوارا نہ تھا۔ کوئی شخص چھوٹا سا کام کرتا، ذرا سا تحفہ

دیتا تو وہ اس سے کہیں زیادہ بدلہ کرتے تھے اور پھر بھی احسان مند رہتے تھے۔

اپنے سے چھوٹوں کی مولانا حالی ہمیشہ بڑی عزت کرتے تھے ان سے ادب اور عزت سے گفتگو کرتے۔ خط اس طرح لکھتے جیسے بزرگ یا برابر کے معزز دوست کو لکھا جا رہا ہو۔ ایک بار کا واقعہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے: "میں اور حمیدالدین مرحوم ان سے ملنے گئے تو وہ سروقد تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمیدالدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں۔ آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔"

قابل اور ہونہار نوجوانوں کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ آج کل کے کئی بڑے بڑے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی سب سے پہلے حالی نے کی۔ کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی تعریف کرتے اور لکھنے والے کا دل بڑھاتے۔ مولانا محمد علی اور ان کے اخبار "ہمدرد" کی بڑی تعریف اور قدر کرتے تھے۔ مولوی ظفر علی کے اخبار "زمیندار" اور ان کی اس وقت کی قومی خدمات سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں ایک نظم لکھی۔ مولوی عبدالحق کے اخبار "افسر" کی تعریف اور اس کے مضامین کی داد اُن کے بہت سے خطوں میں ملتی ہے جو انھوں نے مولوی عبدالحق کو لکھے ہیں۔

ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں "شیخ عبدالقادر صاحب تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ممتاز شخص ہیں اور میرے دوست ہیں۔ اُن کو نہ صرف انگلش لٹریچر سے بلکہ اردو لٹریچر سے ایک خاص مناسبت ہے۔ اور اس کا ثبوت وہ مضمون ہے جو انھوں نے جدید اردو لٹریچر کے مصنفین پر لکھا ہے اور اس باب میں شمال مغربی اضلاع کے لوگوں پر جو کہ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں اپنی فوقیت ثابت کر دی ہے۔ کیونکہ آج تک دلّی سے لکھنؤ تک کے کسی شخص نے اس مضمون پر قلم نہیں اٹھایا۔ رہی یہ بات کہ بعض جزئیات میں آپ نے اُن سے اختلاف کیا ہے یہ اپنا اپنا مذاق ہے۔"

ایک خط میں خود مولوی عبدالحق کے مضمون کے بارے میں لکھا ہے "آپ کا آرٹیکل جو علی گڑھ کالج کی شورش کے متعلق پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے میں نے کئی مرتبہ پڑھا اس کا زور اور سچائی اور وضاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔۔۔۔۔۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے۔۔۔۔۔"

حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ایک رسالہ "علمائے سلف" دیکھ کر اس کی بڑی تعریف کی: "اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت بہ نسبت سابق کے اضعاف مضاعفہ کر دی ہے مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے۔۔۔۔۔ آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سلف ہلپ کے لکھنے میں کیا تھا۔۔۔۔"

مولوی خواجہ غلام الحسنین مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے علمی و ادبی مذاق کو ابھارنے اور اُن کو قومی کاموں کا شوق دلانے میں بھی حالی کا بڑا حصّہ اور اثر تھا۔ وہ اُن کی علمی ادبی سرگرمیوں سے بڑے خوش ہوتے اور ہمیشہ اُن کی عزت افزائی کرتے رہتے تھے۔

اگر کسی کی بات نامناسب یا غلط سمجھتے تو ایسی محبت اور نرمی سے سمجھاتے تھے کہ اسے ذرا ناگوار نہ ہو۔ مولوی ظفر علی خاں نے اپنے اخبار "دکن ریویو" میں مولانا شبلی کی کسی کتاب پر دو ایک مضمون لکھے اور اس میں "بے جا شوخی" سے کام لیا۔ یہ بات حالی کو نامناسب معلوم ہوئی۔ ایک مرتبہ وہ ملنے آئے تو مولانا حالی نہایت نرمی اور شفقت سے انھیں بڑی دیر سمجھاتے رہے۔ اور وہ اس قدر شرمندہ ہوئے کہ سر نیچے سے اوپر نہ اٹھا سکے۔ حالی نے کہا: "میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی۔ لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔"[1] یہی نہیں بلکہ بچوں تک کو جب نصیحت کرتے تو اس قدر شفقت اور نرمی سے سمجھاتے تھے جو دل پر جا کر براہِ راست اثر ڈالتی تھی۔ اُن کی نصیحت میں تنبیہہ سے زیادہ مشورے کا رنگ ہوتا تھا۔

مولانا حالی کے بعض ہم عصروں کو اُن کی یہ بات ناگوار تھی کہ وہ نوجوانوں کی اس قدر تعریف کرتے اور اُن کے کاموں کی داد دینے میں اتنی فیاضی برتتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اس سے اُن کا دماغ پھر جاتا ہے۔ شاید اس پہلو کی طرف اُن حضرات کی نظر نہیں جاتی تھی کہ ایسی تعریف دماغ خراب کرنے والی نہیں زندگی بنانے والی ہوتی ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ حالی میں اپنے ہم عصروں سے بھی رشک اور رقابت کا جذبہ نہ تھا۔ ادبی چشمک پرانی

---

[1] چند ہم عصر از مولوی عبدالحق۔

چیز ہے اور بہت ہی غیر معمولی سیرت و شخصیت کے آدمی کے سوا عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کی آپس کی رقابت اتنی عام ہے کہ اس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ خود مولانا حالیؔ کے بعض ہم عصر اُن کی غیر معمولی علمی اور ادبی قابلیت اور عزت پر بڑا رشک کرتے تھے اور بعض تو اس رشک کو چھپا بھی نہیں سکے۔ لیکن مولانا حالیؔ کے دل میں اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی بڑی عزت تھی۔ اور وہ بڑی فیاضی اور کھلے دل سے اُن کی تعریف کرتے تھے۔ سرسیدؔ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لیکن مولوی نذیر احمد، مولانا شبلیؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ سب کے ساتھ ان کا یہی رویہ تھا۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر جو ریویو لکھے ہیں اُن میں علمی دیانت اور دلی فیاضی کے ساتھ ان کی خوبیوں کو سراہا ہے۔

ایک خط میں مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں "شمس العلما مولانا شبلیؔ کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدے پر عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم کرکے بے انتہا مسرت ہوئی۔ اگر آپ اُن سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام نیاز کے کہہ دیجیے گا کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کے مقابلے میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا۔ مگر بہرحال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے میرے نزدیک بہت بہتر ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملے گا اور قوم کو آپ زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے۔"

مہمان کے آنے سے مولانا کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ اُن کے ہاں اکثر مہمان آتے رہتے اور وہ ہر ممکن آسائش جو اس کے لیے مہیا کر سکتے ضرور کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ ایک بار مولوی انوار احمد پانی پت گئے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ حالیؔ کے ہاں پہنچے تو دالان میں روئی کے پردے پڑ چکے تھے اور مولانا حالیؔ فرش پر انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُٹھ کر ملے۔ مزاج پُرسی کی۔ پاس بٹھایا، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے پر پانی پت کی مشہور بالائی منگا کر کھلائی اور سونے کے لیے بستر کرایا۔ بیچ رات میں مولوی انوار احمد کی آنکھ کھلی تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ان کی رضائی چھو رہا ہے۔ پوچھا کون؟ تو حالیؔ بولے، "آج سردی بہت ہے مجھے خیال ہوا، شاید آپ کے پاس اوڑھنے کو کافی نہ ہو تو یہ کمبل اڑھا رہا تھا۔"

باوجود ہمیشہ علمی، ادبی اور قومی کاموں میں گھرے رہنے کے وہ اپنے خاندانی فرائض ادا کرنے کے

لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیتے تھے۔ اُن کا خاندان بہت بڑا تھا۔ اپنے بہن بھائی، رشتے کے بہن بھائی، اپنی اولاد، بھائیوں اور بہنوں کی اولاد اور ان سب کی اولاد کی اولاد۔ کئی سو آدمیوں کا حلقہ تھا جس کا مرکز حالیؔ کی ذات تھی۔ وہ جیسی محبت اور جتنا خیال قریبی عزیزوں کا رکھتے اتنا ہی دور کے رشتے داروں کا کرتے۔ لڑکوں کی تعلیم کا انتظام، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کی ملازمت کی فکر حالیؔ کے سر تھی۔ نسبت ناتے شادی بیاہ، لڑائی جھگڑے ہر موقعے پر اُن سے مدد لی جاتی تھی اور وہ بڑی خوش دلی سے مدد کرتے تھے۔ جب خاندان میں دو فریقوں میں (ساس بہو، نند بھاوج، میاں بیوی وغیرہ) لڑائی ہوتی تو حالیؔ پنچ بنائے جاتے اور میں نے اپنی بزرگ عورتوں اور مردوں سے سنا ہے کہ مولانا ہمیشہ اس خوبی سے فیصلہ کرتے کہ دونوں فریقوں میں سے کسی کو شکایت نہ ہوتی اور مطمئن ہو جاتے تھے۔

حالیؔ نے سفر بھی بہت سے کیے ہیں۔ وہ عزلت نشیں ادیب اور خلوت پسند شاعر نہ تھے۔ نوجوانی سے لے کر ۸۰ سال کی عمر تک وہ برابر سفر کرتے رہے۔ اُن کا سب سے پہلا سفر پانی پت سے دلیؔ کا تھا جو پاپیادہ طلبِ علم میں کیا گیا اور آخری سفر ۱۹۱۳ء میں وفات سے کچھ عرصہ پہلے فرید آباد کا تھا جہاں وہ اپنے دیوان کی ترتیب و اصلاح کی غرض سے جا کر چھ مہینے رہے تھے۔ تقریباً ۶۰ سال کے اس عرصے میں حالیؔ نے بے شمار سفر کیے۔ زیادہ تر یہ سفر کسی مقصد کے لیے خاص طور پر علی گڑھ کالج کے لیے کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دوستوں اور عزیزوں سے ملنے ملانے اور تبدیلی آب و ہوا کے لیے بھی اکثر جایا کرتے تھے۔ دہلی اور علی گڑھ تو گویا پانی پت کے محلے ہی تھے جہاں وہ اکثر جاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ میرٹھ۔ آگرہ۔ فتح پور سیکری۔ غازی آباد۔ الٰہ آباد۔ جبل پور۔ بھوپال۔ اٹاوہ۔ جھانسی۔ کانپور۔ پھپھوند۔ متھرا۔ بندرابن۔ حیدرآباد۔ کراچی۔ بمبئی۔ شملہ۔ کنڈا گھاٹ وغیرہ وغیرہ جانے کا حال اُن کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص کی صحت اس قدر کمزور تھی اور جس نے اتنا بہت علمی، ادبی تصنیفات کا ذخیرہ چھوڑا وہ کیسے ان سب سفروں اور دیگر کاموں کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ جہاں جاتے وہاں کی تحفہ چیزیں ضرور لے کر آتے اور خاندان بھر میں تقسیم کرکے خوش ہوتے۔ خاص طور پر عورتوں اور لڑکیوں کی پسند اور ضرورت کی چیزیں لانے کا بڑا شوق تھا اور جب وطن سے باہر جاتے تو اپنے ہاں کی چیزیں مثلاً پانی پت کی بالائی، پانی پت کے بنے ہوئے چاندی کے خوب صورت اور سڈول موتی، سروتے اور وہاں کا بنا ہوا کپڑا، تحفے کے طور پر دوستوں

کے لیے لے جاتے تھے۔ جب خود ضعیفی کی وجہ سے باہر کم جانے لگے، تو اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ فلاں فلاں چیزیں عزیزوں کے لیے لے کر آنا۔ اپنے والد کی تعلیم اور نمونے کے اثر سے خواجہ سجاد حسین کا بھی یہی معمول تھا کہ جب کبھی کہیں جاتے تھے تو ضرور وہاں کی تحفہ چیزیں لے کر آتے۔ اور اتنی لاتے کہ خاندان بھر میں بانٹی جاسکیں۔

مولانا حالیؔ کو یوں تو سب ہی سے محبت تھی۔ مگر لڑکیوں پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین نے لکھا ہے کہ سرسیدؔ اور حالیؔ میں کئی صفات مشترک تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ "دونوں بزرگوں کو بچوں اور اپنے رشتے داروں سے عموماً اور رشتے کی عورتوں سے خصوصاً بہت محبت تھی"۔ مولانا کے خط پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وسیع دل میں کس کس کی محبت کے لیے کتنی گنجائش تھی۔ خواجہ سجاد حسین کے نام سینکڑوں خط ہیں اور ہر ہر خط اُن کی بے انتہا محبت اور شفقت آمیز نصیحتوں کا آئینہ ہے۔ دوسرے بہت سے عزیزوں کے نام بھی سینکڑوں خط ہیں جن کو پڑھ کر اجنبی اور ناواقف بھی بڑی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ حالیؔ کو خاندان کے ہر ہر فرد سے کتنا انس تھا اور سب کی فلاح و بہبود اور اصلاح کا کتنا خیال رہتا تھا۔ خواجہ سجاد حسین نوجوانی میں اپنی صحت کی طرف سے بے پروا تھے۔ اور اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ وہ ان کو ہمیشہ حفظانِ صحت کے اصول اور دوا علاج کے بارے میں مشورہ دیتے رہتے تھے۔ اُن کی آمدنی اچھی خاصی تھی لیکن بڑے شاہ خرچ تھے۔ اس لیے اُن کو کم خرچ کرنے کی صلاح دیتے اور تدبیریں بتایا کرتے۔ وہ خط لکھنے میں کوتاہی کرتے تو باپ کو بار بار انھیں تاکید کرنی پڑتی تھی۔ ایک دفعہ ناراض ہو کر لکھا کہ میری نہیں تو اپنی ماں کی خاطر ہی جلد جلد خط بھیجا کرو۔

خواجہ تصدق حسین مرحوم (جو مولانا حالیؔ کے چچا زاد بھائی کے بیٹے تھے) بڑے ہونہار اور قابل نوجوان تھے۔ اور حالیؔ کی کوشش سے انھیں ایک اچھی جگہ مل گئی تھی۔ انھوں نے ایک خط میں جب اس بات کا شکریہ ادا کیا تو مولانا نے انھیں جواب میں لکھا: "جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمھاری سعادت مندی اور کسی قدر نادانی کی دلیل ہے۔ بفرضِ محال میری کوشش کو تمھاری کامیابی میں دخل ہو بھی تو اُس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب نہیں کیونکہ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ اور ہوتا رہے گا"۔

کسی عزیز کا انتقال ہو جاتا تو اس کے بچوں اور قریبی عزیزوں کو اس طرح تسلی دیتے اور اس انداز سے تعزیت کرتے کہ رنج و غم کم ہو اور فرائض کا احساس اور مرنے والے کی صفات کو اپنانے کا جذبہ زیادہ پیدا ہو۔ میرے دادا خواجہ غلام عباس کی وفات پر اُن کے بیٹوں کو لکھتے ہیں:

"اس حادثے سے تمھارے تمام خاندان کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کو گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ خصوصاً تمھاری والدہ کی طرف سے جن کی زندگی پہلے ہی سے خطرے میں چلی آتی ہے نہایت فکرمند اور پریشان ہوں۔ بہرحال سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ تم تینوں صاحبوں کو بجائے اس کے کہ اس واقعۂ جاں کاہ پر جزع فزع کو کام فرماؤ اپنی فرض داریوں پر غور کرنا لازم ہے جو والد کی وفات سے تم پر عائد ہوتی ہیں۔ ...... اُمید ہے کہ تم باتفاق ہم دگر اس بوجھ کو اچھی طرح اٹھاؤ گے اور جس طرح علمی زندگی میں تم نے حسنِ قبول کا درجہ حاصل کیا ہے، اسی طرح خانگی زندگی میں قبولیت کا مرتبہ حاصل کرو گے ......"

ایسا کون انسان ہوگا جسے خاندان والوں سے کچھ نہ کچھ تکلیف اور رنج نہ پہنچا ہو۔ خصوصاً جو لوگ علم اور مرتبے میں بڑھ جاتے ہیں ان کو خاندان کی مخالفت اور بھی زیادہ سہنی پڑتی ہے۔ حالیؔ کے خیالات اس بارے میں کیا تھے اور ان کا عمل کیا تھا؟ وہ بھی سنیے۔ اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں:-

"جب سے گھر پر رہنے کا اتفاق ہوا ہے مجھے کلی یقین ہو گیا ہے کہ جب تک ایک تعلیم یافتہ آدمی جو سبب تعلیم کے اپنی سوسائٹی سے بہت آگے بڑھ گیا ہے، خانگی مکروہات کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت نہ کرے اور عمداً گونگا اور بہرہ نہ بن جائے اس وقت تک اس کا اپنی سوسائٹی میں گوارا کرنا ناممکن ہے۔ ہم بھی صبح سے شام تک اس قسم کی مخالف آوازیں سنتے رہتے ہیں اور اوّل اوّل ہم کو بھی وہ نہایت تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی تھیں مگر آخر کار معلوم ہو گیا کہ موجودہ حالت میں ہم کو ان مکروہات سے کسی طرح نجات نہیں اور اس لیے ان پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔ ہماری عورتیں اور مرد اپنے حقوق اور فرائض سے بالکل ناواقف ہیں اور اس لیے اپنے حقوق کی حد سے اکثر متجاوز ہو جاتے اور اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پس بہ نسبت اس کے کہ ان کی شکایت کی جائے وہ درگزر کے زیادہ مستحق ہیں۔ جو لوگ آں حضرتؐ کی جان اور مال اور آبرو کے سخت دشمن تھے اور طرح طرح کے آزار دیتے تھے۔ اُن کی نسبت آپ کی زبان پر ہمیشہ یہ دعا جاری

رہی کہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ جب دشمنوں کو آپ بسبب اُن کی لاعلمی کے معذور رکھتے تھے تو کیا ہم اپنے احمق دوستوں اور دعاگویوں کی حماقت آمیز باتوں سے درگزر نہیں کر سکتے ؟"

حالؔی کی شاید واحد کمزوری طبیعت میں محبت کا بے پناہ جذبہ تھا۔ جس میں یوں تو ہر بنی نوع انسان کا جس سے وہ واقف ہوتے کچھ نہ کچھ حصہ تھا مگر قدرتی طور پر اپنے عزیزوں سے انھیں گہرا لگاؤ تھا مگر اس محبت میں وہ شدت نہ تھی جس کی وجہ سے اپنوں کا قصور اور غلطی نظر نہیں آتی۔ اُن کی محبت خاندان کے ان افراد سے بہت زیادہ ہوتی تھی جو بدنصیب، بیمار اور ہمدردی کے مستحق ہوں یا پھر وہ جو ذاتی صفات اور اعلیٰ خوبیوں کی وجہ سے اُن کے دل میں جگہ بنالیں۔ عورتوں میں انھیں سب سے زیادہ لگاؤ اپنی چھوٹی بہو، اور بڑی پوتی مشتاق فاطمہ سے تھا۔ اس کی وجہ بھی ان دونوں خواتین کی لاثانی صفات تھیں جن میں حالؔی کی تربیت اور اثر کا رنگ صاف جھلکتا تھا۔ ان دونوں کے خصوصاً پوتی کے نام خطوں سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اِن میں نصیحتیں ہیں، ہدایتیں ہیں۔ کہیں کہیں ہلکی سی تنبیہہ بھی ہے مگر ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکی پڑتی ہے۔

پوتی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھا دی ہے۔ تمھاری دادی ہر وقت تمھاری صحت و سلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں۔ تم مجھے صاف صاف لکھو کہ اس ملک (حیدرآباد) کی آب و ہوا کا تم اپنے اوپر کیسا اثر پاتی ہو۔ مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمھاری صحت اچھی ہو جائے گی۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کر آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی مشتاق فاطمہ ہوں"

ایک دوسرے خط میں "میرا جی بہت خوش ہوا کہ تم نے ہر ایک کام کے لیے الگ الگ وقت باندھ رکھے ہیں۔ اور کسی وقت بے کار نہیں رہتیں۔ خدائے تعالیٰ نے دین اور دنیا کی بھلائی اسی میں رکھی ہے کہ آدمی بے کار نہ رہے اور وقت کو عزیز سمجھے۔ جتنے گناہ بے کار آدمی کرتے ہیں اتنے کام والے نہیں کرتے اور جتنے بیمار بیکار آدمی رہتے ہیں اتنے کام والے نہیں ہوتے ......"

"گھبرانا ہرگز نہیں چاہیے ...... میں انشاءاللہ تعالیٰ بہت جلد تمھارے واسطے پڑھنے کے لیے کتابیں بھیجوں گا جن سے تمھارا جی بہلے گا ......"

مشتاق فاطمہ پہلی بار حیدرآباد جاتے ہوئے دہلی اپنے چچا کے پاس ٹھہریں۔ حسبِ دستور وطن میں سب عزیز رخصتی کے وقت خوب روئے دھوئے۔ خواجہ سجاد حسین کو اس موقعے پر لکھتے ہیں کہ "مشتاق فاطمہ جب تک دِلّی ٹھہری رہے، سب کو تاکید کر دو کہ اس کے سامنے رنج و غم کی باتیں نہ کریں، بلکہ ایسی باتیں کریں جن سے اس کے دل کو تقویت ہو اور حُزن و ملال زیادہ نہ ہو۔ یہاں آٹھ سات روز تک عورتوں نے اس کو دن بھر بلکہ رات بھر بھی رُلایا ہے۔ اندیشہ ہے کہ وہ خدانخواستہ علیل نہ ہو جائے۔"

اپنی بیٹی اور دونوں نواسوں فرزند علی اور عبدالولی کا سارا بار مولانا حالؔی پر تھا۔ اس لیے کہ ان کے داماد اپنی بیوی بچوں سے لاپروا اور بیگانہ تھے، اور یہ ساری ذمّے داریاں بھی حالؔی ہی کو اٹھانا پڑیں۔

عبدالولی بچپن سے بڑے ذہین اور لکھنے پڑھنے کے بے حد شوقین تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہی مرگی کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مولانا حالؔی نے ہزارہا قسم کے علاج معالجے کرائے، دنیا بھر کی تدبیریں کیں۔ لیکن اُن کو صحت نہ ہوئی۔ اور وہ بیچارے آخر عمر تک اس موذی مرض میں مبتلا رہے۔ حالؔی ان کی ذہانت اور تیزی کی وجہ سے بچپن ہی سے اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ بعد میں ان کے اس روح فرسا مرض اور اُن کی بے بسی اور لاچاری کے سبب اس محبت میں انتہائی دردمندی بھی شامل ہو گئی تھی۔ بیماری نے خواجہ عبدالولی کا مزاج بہت چڑچڑا کر دیا تھا اور بعض اوقات تو اُن پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اس حالت میں وہ اپنے نانا اور ماں کو بہت پریشان کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی گستاخی تک کر بیٹھتے تھے۔ مگر مولانا نہ صرف اُن کی باتیں برداشت کرتے بلکہ خوش دلی اور خندہ پیشانی سے سہتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ عبدالولی نے مولانا سے گستاخی کی اور انھیں شاید دھکّا دیا جس سے مولانا گر پڑے۔ خواجہ سجاد حسین اُس وقت موجود تھے۔ اُن کا مزاج بڑا حلیم تھا لیکن وہ کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے بھانجے کو ڈانٹا اور ایک طمانچا بھی مارا۔ حالؔی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ اور جب تک خواجہ صاحب نے بھانجے کو منا نہیں لیا، حالؔی نے اپنے لائق فائق سعادت مند بیٹے سے بات نہیں کی۔ اُن کی بیماری پر

مولانا نے ہزاروں روپیہ صرف کیا اور اُن کی ناز برداری اور تیمار داری میں اپنی زندگی تلخ کرلی مگر اس بیماری کے مارے غم زدہ نوجوان کی ذراسی دل آزاری کبھی گوارا نہیں کی۔ اُن کے بیشتر خطوں میں اپنے اِن نواسے کا ذکر ملتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اُن سے کتنی محبت تھی۔ اور اُن کی بیماری کا کیسا سخت قلق تھا۔ خواجہ عبدالولی مرحوم اکثر اپنے نانا کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کرتے تھے اور ہمیشہ ذکر کرتے وقت اُن کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی تھیں۔ یوں بھی میں نے خاندان کے کسی بڑے چھوٹے کو نہیں دیکھا جو حالؔی کا ذکر انتہائی احترام سے نہ کرتا ہو اور ذکر کرتے وقت اس کی چشم پُر نم نہ ہو جائے۔

خواجہ فرزند علی مولانا کے بڑے نواسے کھیل کود کے بڑے شوقین تھے۔ اسکول کی بندشوں سے گھبراتے اور کتابی تعلیم سے بھاگتے تھے۔ مولانا کو اُن کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ ہر طرح اس کی کوشش کرتے تھے کہ اُن کا دل لکھنے پڑھنے میں لگے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام سینکڑوں خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ مولانا حالؔی نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم پائیں آخر اس کی طرف اُن کی توجہ نہ دیکھ کر انھیں ایف۔ اے کے بعد انجینئرنگ میں بھیج دیا تھا جہاں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ خواجہ فرزند علی مرحوم بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ " دیکھو مولانا حالؔی کو مجھ سے کتنی محبت اور میرا کتنا خیال تھا کہ تقریباً ہر خط میں میرا ذکر موجود ہے۔"

اپنی بیٹی عنایت فاطمہ کی اس بدنصیبی کا کہ شوہر ان سے بے تعلق اور بیٹا ایسے موذی ولاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔ مولانا کو دلی صدمہ تھا، انھیں ہمیشہ اُن کی فکر اور دلداری کا خیال رہتا تھا اور ان حالات نے اُنھیں ہمیشہ فکر و کوفت میں مبتلا رکھا۔ لیکن یہ مصائب بھی ان میں تلخی اور بیزاری نہ پیدا کر سکے۔ وہ اپنے یہ فرائض انتہائی ہمدردی اور دلسوزی سے پورے کرتے تھے مگر اس کے ساتھ دنیا کے اور سب کاموں کو وہ خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ادا کرتے تھے۔ زندگی کی تلخیوں کو شیریں بنا کر گوارا کرنے کا گُر قدرت نے انھیں سکھا دیا تھا۔

مولانا حالؔی کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین ایک صوفی منش بزرگ تھے اور وہ بھی خاندانی معاملات اور بچوں کی تعلیم وغیرہ کی کچھ زیادہ فکر نہ کرتے تھے۔ اس لیے اُن کے دونوں بیٹوں خواجہ احتاق حسین اور خواجہ اکرم حسین کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بھی مولانا حالؔی ہی پر تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" حقن (احتاق حسین) انگریزی میں تو چل نکلا ہے۔ مگر حساب میں ابھی تک صفر ہے۔ ابھی دھیان اور توجہ لکھنے پڑھنے میں پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن خصلتیں عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اطاعت اور حکم برداری مزاج میں بہت ہے، کاہل نہیں ہے۔ اور روز بروز غریب ہوتا جاتا ہے، گھر جانے کا کبھی نام نہیں لیتا جس بات کو منع کرو پھر نہیں کرتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس کے دل میں کچھ شوق اور توجہ پیدا ہو جائے تو اسے علی گڑھ ظہور حسین وارڈ میں داخل کر دیا جائے۔"

رشتے کے ایک پوتے کے فیل ہونے کی خبر سنی تو بہت افسوس ہوا۔ اُن کے والد کو خط لکھا جس میں اظہار افسوس کے ساتھ ہی کس دلسوزی سے لکھتے ہیں۔ " طالب علم کتنا ہی بدشوق ہو مگر فیل ہونے کا رنج و ملال سب کو یکساں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کی دلجوئی کرنا چاہیے اور ملامت و نفرین سے احتراز کرنا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہہ دینا رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت استقلال سے پھر کوشش کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ضرور کامیاب ہوگے۔"

ہمیشہ لڑکوں اور بچوں کے خط کا جواب اُسی پابندی سے دیتے جیسے بڑے آدمیوں کے خطوں کا۔ اُن کا طرزِ تحریر یوں بھی سادہ، شستہ اور آسان ہے لیکن عورتوں اور بچوں کو جب خط لکھتے تو خاص طور پر وہ لہجہ اور زبان استعمال کرتے تھے جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے تھے کہ بہت خوش خط اور صاف صاف لکھیں تاکہ انھیں پڑھنے میں آسانی ہو۔

خواجہ فرزند علی کو لکھتے ہیں۔ " میری جان اب کے لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا اطمینان رہے۔"

بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ آنکھ کی بینائی بہت کم ہو گئی ہے، لکھنا پڑھنا بہت مشکل معلوم ہونے لگا ہے۔ لیکن جس کسی کا خط آئے جواب دینا ضروری ہے۔ خواجہ احتاق حسین کو لکھتے ہیں۔ " مجھے اب ایک ایک حرف لکھنا دشوار ہو گیا ہے اس وجہ سے تمھیں خط نہیں لکھا تھا۔ تم بچوں کی طرح خفگی اور ناراضگی کا خیال دل میں نہ لایا کرو۔ میں تم سے ناراض ہوں گا تو راضی کس سے ہوں گا۔"

اکثر عید بقر عید کے موقعے پر خاندان بھر کی لڑکیاں بالیاں مولانا کے ہاں جمع ہوتیں۔ رات گئے تک سب کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگتی رہتی۔ جب سب کے مہندی لگ چکتی تو ایک لڑکی

ایسی رہ جاتی جس کا ایک ہاتھ مہندی لگنے اور کپڑا باندھا جانے سے باقی رہ جاتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اس وقت مولانا حالیؔ اوپر اپنے کمرے سے اپنی چلم بھرنے نیچے کے گھر میں آجاتے اور پوچھتے "بھئی اَب تک کیا ہو رہا ہے؟" لڑکیاں کہتیں ! بابا سب کے مہندی لگ گئی بس اس کا ایک ہاتھ رہ گیا ہے۔ کہتے اچھا لاؤ ہم لگا دیں (یا ہاتھ باندھ دیں)۔ اور خود لڑکی کے ہاتھ میں مہندی لگا کر اس پر کپڑا باندھ کر خوش ہوتے ہوئے واپس چلے جاتے۔

مولانا حالیؔ کو بڑی عمر کے بچوں ہی سے نہیں ننھے بچوں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ بچے جب بڑے ہو جاتے اُس وقت مولانا اُن سے زیادہ بے تکلّف نہیں ہوتے تھے اور بچے بھی عموماً مولانا کے سامنے مرعوب اور باادب رہتے تھے۔ لیکن چھوٹے بچوں سے انھیں بڑی دلچسپی اور بہت محبت تھی۔ جیسے ہی خاندان میں کوئی بچّہ پیدا ہوتا وہ جا کر اُسے دیکھتے، اُٹھا کر اُسے پیار کرتے اور گود میں لیکر آ بیٹھے رہتے اور پھر عرصے تک یہ ننھا بچہ ان کی توجہ اور اُلفت کا مرکز بنا رہتا۔ ننھے بچے القرآن کے پاس جا کر کھیلا کرتے اور اُن کو ستاتے لیکن مولانا اس سے ذرا بھی پریشان نہ ہوتے تھے بلکہ بہت دلچسپی سے اُن کی حرکتیں دیکھتے رہتے۔ ایک خط میں اپنی نواسی کے بچے کے بارے میں لکھتے ہیں "محمود اس وقت بہت تنگ کر رہا ہے اور خط نہیں لکھنے دیتا۔ اس لیے خط کو ختم کرتا ہوں"۔

خواجہ غلام السیّدین اُن کی پوتی کے بڑے بیٹے ہیں۔ اس لیے خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔ جب ماں اپنے دادا کے ہاں جاتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس ٹھیرا کرتی تھیں۔ اوپر دیوان خانے میں مولانا حالیؔ رہتے تھے۔ سیدین مولانا سے بہت مانوس تھے۔ جب وہ نیچے سے اوپر چلے جاتے تو یہ نیچے سے پکارتے "بابا" اور مولانا آواز سن کر نیچے اترتے، بچے کو پیار کرتے اور پھر اوپر چلے جاتے۔ سیدین پھر پکارتے "بابا" اور وہ پھر اسی طرح نیچے آتے پیار کرتے اور چلے جاتے۔ بچوں کو تو کسی بات کی تکرار میں مزہ آتا ہے۔ والدہ مرحومہ سنایا کرتی تھیں کہ سیدین جتنی مرتبہ انھیں "بابا" کہہ کر بلاتا وہ اس ضعیفی کے عالم میں ہر مرتبہ نیچے اُتر کر آتے اور اُسے پیار کرتے تھے۔

سیّدین صاحب کی چھوٹی بہن سیّدہ خاتون (مرحومہ) بڑی پیاری، بھولی اور ذہین بچی تھی۔ اور مولانا حالیؔ اس بچّی کو بے حد چاہتے تھے۔ انھوں نے سیّدہ خاتون پر ایک چالیس بیت کی نظم بھی لکھی ہے۔ جو علاوہ ذاتی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے اُن کے مشاہدے کی باریکی پر بھی روشنی

ڈالتی ہے؛

سیّدہ کیسی پیاری بچّی ہے   صورت اچھی، سمجھ بھی اچھی ہے

ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان   پر ہے اچھے بُرے کی سب پہچان

اس نظم کو پڑھ کر جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچّی سے مولانا کو کس قدر لگاؤ تھا۔ وہاں یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے:

جھوٹ موٹ اُس کو گر ڈراتے ہیں   بات ڈر کی کوئی سُناتے ہیں

پکّے پن سے یقین نہیں کرتی   دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

اور:۔

اوپری شکل سے ہے گھبراتی   ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

اوپر تلے کے بھائی بہن میں جو مزیدار لاگ ہوتی ہے۔ اُس کا ذکر دیکھیے:۔

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اُس کو   کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں

پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا   اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا

جا لپٹتی ہے دوڑ کر ماں سے   بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

اور کس پیار بھرے انداز میں بچّی کی توتلی زبان کی تعریف کرتے ہیں:۔

یوں تو تھی جب ہی پیاری اسکی زبان   جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں

پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار   ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار

نہیں منہ سے نکلتے پورے بول   بولتی ہے سدا ادھورے بول

لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب   زرگری اپنی بولتی ہے جب

اس پوری نظم کو پڑھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بچوں کی سیدھی سادی پیاری زبان میں اُن سے باتیں کر رہا ہے۔

اپنے بزرگوں سے میں نے ایک دلچسپ قصہ سُنا ہے۔ برسات کا زمانہ تھا۔ گرج چمک ہو رہی تھی۔ مولانا حالیؔ دالان کے بیچ کے در کے سامنے تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور سیّدہ

خاتون جو اس وقت شاید سال بھر کی تھیں اُن کی گود میں لیٹی اپنی ”غوغاں“ سے اُن کا دل لُبھا رہی تھیں۔ پاس ہی تخت پر کانسی کا ایک خالی پیالہ رکھا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ہی بڑے زور کا تڑاخا ہوا۔ ایک شعلہ سا چمکا۔ بجلی پیالے پر گری، مولانا کی گود میں لیٹی ہوئی بچی کے بھورے بالوں کو جلاتی ہوئی، سہ دری کے روشن دان سے باہر نکل گئی۔ سہ دری میں ریشمی کپڑوں کا جو بکس رکھا تھا جب اس کو کھولا گیا تو اندر سے سارے کپڑے محض راکھ کے ڈھیر تھے۔ مگر خدا کی قدرت کہ مولانا اور بچی دونوں بالکل محفوظ رہے۔ اور سوا سیدہ مرحومہ کے چند بالوں کے ”بال بال“ بچ گئے۔

حالی ۱۳ء میں کچھ عرصے کے لیے فرید آباد جا کر رہے تھے۔ وہاں سے جو خط لکھے ہیں اس میں بار بار اپنی پر نواسی احمد فاطمہ کا جو اس وقت دودھ پیتی بچی تھی، ذکر لکھتے ہیں ”احمد فاطمہ طالعہا الثریا دآتی ہے۔ امید ہے کہ عنقریب اسے پہلے سے زیادہ تماشے کرتے دیکھوں گا۔“

”اگر احمد فاطمہ اور اظہر عباس طالعہما کے ٹیکا اَب تک نہ لگا ہو تو اب ضرور لگوا دینا۔“

احمد فاطمہ کا دودھ چھٹنا تو ظاہر ہے کہ بچی پریشان ہوگی۔ اس معمولی بات کا ایسا گہرا اثر لیتے ہیں:

”امدو طالعہا کا پرسوں دودھ چھٹا دیا ہے۔ سُنا ہے کہ ایک رات اور ایک دن نہایت سخت گزرا۔ کل سے وہ حال نہیں پر حد سے زیادہ نازک مزاج ہو گئی ہے۔ صبح سے دو مرتبہ میرے پاس آ چکی ہے۔ آتے ہی پھر گھبرا کر چلی جاتی ہے۔“

اور پھر یہ محبت صرف اپنے بچوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اپنے پرائے سب کے بچے اس شفقت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہو، کسی ملازمہ کا یا مہترانی کا بچہ کہیں پڑا ہوا دیکھ لیں سب سے شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ بچوں کی تکلیف سے تو ایسے بے قرار ہو جاتے تھے کہ کوئی اپنی تکلیف سے بھی نہ ہوگا۔ فرید آباد کے قیام کے دوران میں آن کے مکان کے باہر کسی کوٹھری میں ایک عورت وزیرن مع اپنے بال بچوں کے رہتی تھی۔ ایک دن اس کا چھوٹا بچہ بیمار ہو گیا اور رات بھر روتا رہا۔ مولانا حالی نے آواز سُنی تو بے چین ہو گئے۔ دسمبر کا مہینا شدید سردی، اٹھہتر سال کی عمر مگر نہ رہا گیا۔ اُٹھے، باہر نکل کر وزیرن کو آواز دی، بچے کا حال پوچھا اور

کہا ڈاکٹر کو بلاؤں۔ اُس نے کہا مولوی جی صبح کو دیکھا جائے گا۔ مولانا وزیرن کو تسلی تشفی دے کر چلے تو آئے مگر رات بھر بچے کے خیال سے بے چین رہے اور صبح ہی ڈاکٹر لیاقت حسین کو وزیرن کے ہاں بھیجا اور جب تک بچہ اچھا نہ ہو گیا۔ برابر اُن پر تاکید کرتے رہے کہ بچے کا خیال سے علاج کریں۔

ایک اور واقعہ اس سے بھی زیادہ پُر اثر ہے۔ پانی پت میں ایک مرتبہ حالی کسی جگہ سے تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گرا پڑا ہے اور کیچڑ اور گندگی میں لت پت پڑا چلا رہا ہے۔ آس پاس بہت سے آدمی جمع کھڑے دیکھ رہے تھے اور رام رام کر رہے تھے مگر کوئی اُسے اُٹھاتا نہیں۔ مولانا نے فوراً اپنا تانگا ٹھیرایا۔ پاس گئے بڑی آہستگی سے اُسے نالی میں سے نکالا۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے کپڑے اتارے اور اس کے ماں باپ کا پتا پوچھ کر خود وہاں چھوڑ کر آئے۔ چلتے ہوئے لوگوں سے کہا ”جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اُسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔“ یہ ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہے۔

اپنے ملازموں کے ساتھ مولانا حالی کا جو سلوک تھا اُس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔ وہ اُن کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے اور اُن کے کھانے پہننے اور آرام وغیرہ کا لحاظ اس طرح رکھتے جیسے اپنے بچوں کا۔ اور اُن کی عزت اور اُن کے ساتھ سلوک ایسا کرتے جیسے برابر کے دوست یا عزیز کا۔ یوں تو کئی نوکر اُن کے پاس رہے مگر دو ملازم اُن کے خاص تھے۔ ایک نانوں خاں، دوسرا عطاء اللہ، نانوں خاں کبھی کبھی خواجہ سجاد حسین کے ساتھ اُن کی ملازمت پر بھی جایا کرتا تھا۔ خواجہ سجاد حسین کے نام کے پچاسیوں خطوں میں نانوں خاں کا ذکر، اُس کے بال بچوں کی خیریت، اسے دعا سلام وغیرہ لکھا ہوا ملے گا۔ نہ جاننے والے کو یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ اس پابندی، دل سوزی اور لگن سے ایک ملازم کی پرسش کی جا رہی ہے” نانوں خاں کو دعا کہنا اور آرام سے رکھنا۔“ ”اس کو چاہیے کہ پانی پت خط برابر لکھتا رہے۔“

”نانوں خاں کے بچے کا کل سے کچھ حال نہیں معلوم ہوا۔ شاید کل یا پرسوں وہ آیا تھا کہتا تھا بچے کا دم چلتا ہے۔ مجھے بھی اس کے بچنے کے کچھ آثار معلوم نہیں ہوتے۔“ خواجہ سجاد حسین بیمار تھے اور خط کا جلدی جواب نہیں دیتے تھے۔ نانوں خاں نے مولانا کو اُن کی طبیعت کا حال لکھا،

تو اُنھوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہدایت کی کہ برابر اُسی طرح خط لکھتے اور مجھے اطلاع دیتے رہا کرو۔ بعد میں وہ مولانا حالؔی کے پاس ہی آگیا تھا اور اُن کی وفات تک اُن کے پاس رہا۔ مولانا کے انتقال کے بعد نانوں خاں اکثر اُن کا ذکر کرکے رویا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے یہ قصہ سنایا کہ مٹی کا تیل نیا نیا چلا تھا۔ تیل کی ڈبیہ ٹپکتی تھی جو ایک رکابی میں رکھی تھی۔ کسی نے ڈبیہ ہٹا لی۔ نانوں خاں آئے، دیکھا رکابی میں پگھلا ہوا گھی رکھا ہے۔ جھٹ اُٹھایا اور پی گئے۔ اب جو بدبوآئی تو سمجھے کہ گھی کے دھوکے میں مٹی کا تیل پی گئے۔ روتے دھوتے مولانا حالؔی کے پاس پہنچے۔ اور بولے بس میاں اب تو ہم مرلیے ...... پیٹ میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے پوچھا تو سارا حال سنایا۔ مولانا کو بھی معلوم نہ تھا کہ مٹی کے تیل کی خاصیت کیا ہے۔ بے حد گھبرائے، اسی وقت حکیم کو بلایا اور نانوں خاں کی تیمار داری میں لگ گئے۔ اُسی دن مولانا حالؔی کو نواب لوہارو کے ہاں دعوت میں جانا تھا۔ دیر ہوئی تو نواب صاحب کا آدمی بلانے آیا۔ حالؔی نے انھیں معذرت لکھ بھیجی کہ "افسوس ہے حاضر نہیں ہو سکتا۔ نانوں خاں مٹی کا تیل پی گیا ہے اور میں اس کی دیکھ بھال کر رہا ہوں"

سردی کا زمانہ تھا...... نانوں خاں پرانے کپڑوں میں اکڑتا پھر رہا تھا۔ حالؔی نے پوچھا نانوں خاں کوئی گرم کپڑا نہیں بنایا؟ اُس نے جواب دیا۔ گنجائش نہیں بناؤں کہاں سے؟ مولانا نے فوراً روئی کی جو نئی مرزئی پہنے تھے اُتار کر اُسے پہنادی۔

نانوں خاں کہا کرتا تھا مولوی صاحب تو ولی تھے ولی۔ اب ایسے آدمی ڈھونڈے نہیں ملتے۔ اُنھوں نے کبھی مجھے نہ کوئی سخت لفظ کہا نہ کبھی خفا ہوئے۔

مولانا حالؔی کا دوسرا چہیتا ملازم عطاء اللہ تھا۔ وہ عرصے سے مولانا کے پاس رہتا تھا اور اُن کے انتقال کے بعد جب تک زندہ رہا خواجہ سجاد حسین کے پاس رہا۔ میں نے بھی اُسے دیکھا تھا۔ کانوں سے اس قدر اونچا سنتا تھا کہ چیختے چیختے گلا پھٹ جاتا۔ لیکن اُس کا سُن لینا محض حُسنِ اتفاق تھا۔ ایک ٹانگ بالکل بے کار تھی۔ ہاتھوں میں بھی کچھ نقص تھا۔ اور مزاج اس قدر خراب کہ خدا کی پناہ۔ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا، اور خوب چیختا چلّاتا۔ بات نہ سنتا

تھا نہ سمجھتا تھا۔ کام اچھی طرح سے نہ کر سکتا تھا لیکن اپنی حمایت میں لڑنے کو ہمیشہ تیار رہتا۔ شاید اُس کے اِن نقائص ہی کی وجہ سے حالؔی کو اُس سے خاص ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ اُس کی ہر بدمزاجی، کام چوری اور ہاتھ چالاکی کو خندہ پیشانی سے سہہ لیتے تھے۔ ساری عمر اُسے اپنے سے جدا نہیں کیا اور نہ کبھی اُسے ڈانٹا نہ اُس سے ناراض ہوئے۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کے حالؔی سے بہت تعلقات تھے۔ سالہا سال تک اُن کا یہ معمول تھا کہ روزانہ صبح شام مولانا کے ہاں آتے، اور گھنٹوں بیٹھتے۔ اُنھوں نے عطاء اللہ کی ساری صفات خوب دیکھی تھیں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے "اگر علاوہ اور خوبیوں کے عطاء اللہ اندھا بھی ہوتا تو بلا مبالغہ مولانا کے نقطۂ خیال سے اُس میں ایک خوبی کا اضافہ ہو جاتا"

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اپنی کتاب تذکرۂ حالؔی میں عطاء اللہ کی زبانی لکھا ہے: "اجی تم سے کیا کہوں ...... مولوی صاحب بڑے اچھے آدمی تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ چیز بازار سے منگائی اور روپیہ دیا۔ میں نے باقی کے پیسے لا کر دیے تو کبھی پیسے گنے نہیں .... مولوی صاحب کو چائے پینے کی بہت عادت تھی اور اس کے لیے چینی اور بسکٹ بہت آتے رہتے تھے۔ چائے میں ہی تیار کرتا تھا۔ اور بسکٹ وغیرہ میری کوٹھری میں ایک صندوق میں رکھے رہتے تھے۔ میرا جب جی چاہتا یا بھوک لگتی تو بسکٹ نکال کر کھا لیا کرتا۔ گرمی کا موسم ہوتا تو چینی کا شربت بنا کر پیا کرتا۔ اس طرح چینی اور بسکٹ جلدی سے ختم ہو جاتے۔ جب کوئی چیز نہ رہتی تو میں مولوی صاحب سے کہتا۔ مولوی صاحب اشارے سے کہتے اچھا اور منگا دیں گے۔ کبھی اُنھوں نے یہ نہ کہا ابھی تو چیز منگائی تھی اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئی .... اپنے پہننے کے کپڑے مجھے ہمیشہ پہننے کو دے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں میں نے شکایت کی کہ رات کو بڑی سردی لگتی ہے مولوی صاحب نے فوراً اپنی رضائی جو ابھی نئی بنوائی تھی کھونٹی سے اُتار کر مجھے دیدی۔ میں نے کہا یہ تو ابھی کل ہی آئی ہے۔ مجھے کوئی پرانی رضائی دے دو۔ کہنے لگے نہیں یہ تم لے لو۔ ہم اور بنوا لیں گے......"

مولانا حالؔی کی وفات کے بعد خواجہ سجاد حسین بھی عطاء اللہ کو اپنے والد کا عزیز ملازم سمجھ کر بڑی عزت کرتے اور اُس کی بدمزاجیوں کو صبر سے سہتے تھے۔ گھر میں کسی کی مجال نہیں

تھی کہ عطاء اللہ کو کچھ کہہ سکے۔

مولانا حالی کے مکان کے دروازے میں ایک کوٹھری تھی جس میں ایک غریب عورت رہتی تھی۔ یہ شاید جوگیوں میں سے تھی۔ اور اُس نے فقیری لے رکھی تھی۔ احترام کے طور پر اُسے نہ صرف بچے بلکہ خود حالی "مامی" (ممانی) کہتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ عطاء اللہ کی چیخ پکار سُن کر وہ اپنے ہاں سے نکل کر آتی اور کہتی مولوی صاحب آج عطاء اللہ کو بڑا غصہ ہے۔ فرماتے ہاں بھئی کبھی ہم اُس پر ناراض ہو لیتے ہیں کبھی وہ ہم پر۔ آج اُس کی باری ہے۔ مامی کا بیان ہے کہ میں جب کبھی اُن کے پاس جاتی تو پہلے خود سلام کرتے اور بڑے اخلاق سے باتیں کرتے۔ اکثر روپیہ دیتے۔ کبھی کبھی فرمائش کر کے مچھلی پکواتے اور تیل کی مچھلی بڑی رغبت اور تعریف سے کھاتے۔ وہ کہتی تھی کہ میں نے کبھی بھی اُن کے منہ سے کوئی بُرا لفظ، گالی یا کوسنا نہیں سنا۔

صرف اپنے ملازم ہی نہیں دوسرے عزیزوں کے ملازموں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ کوئی عورت کسی عزیز خاتون کے ساتھ پردیس جاتی تو ہمیشہ اس کے کنبے بھر کی خیریت اور حال احوال لکھتے رہتے۔ اس کو تسلی تشفی کرتے۔ چھوٹے چھوٹے ملازم بچے جو اکثر گھروں میں رہا کرتے ہیں۔ انھیں تو بالکل اسی طرح چاہتے تھے جیسے اپنے بچوں کو۔

مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ حالی کی سیرت کی دو نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ سادگی اور دردِ دل۔

سادگی بیان میں، زبان میں، نظم میں، نثر میں، کردار میں، گفتار میں ہر جگہ اور ہر موقعے پر دیکھ لیجیے۔

اور دردِ دل تو وہ صفت ہے جس کا پرتو اُن کی زندگی کے ہر ہر گوشے میں نظر آتا ہے۔ اُن کی ساری زندگی ہمدردی، دردمندی، رقتِ قلب، ایثار اور فیاضی سے عبارت تھی۔ سچے ایثار کی صفت اس شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جسے دردِ دل کی انمول دولت میسّر ہو۔ حالی کسی کی ذرا سی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور اُس سے اس طرح بے چین ہو جاتے گویا یہ اُن ہی پر بیت رہی ہے۔ وہ اپنے اس شعر کی آپ ہی تفسیر تھے ؎

چیست انسانی؟ تپیدن از غمِ ہمسایگاں	از سمومِ نجد در باغِ عدن پژمان شدن

جنگِ بلقان کے زمانے میں جب ترکوں کی مصیبتوں اور نقصانات کا حال پڑھتے تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ حیدرآباد میں سیلاب آیا تو اس کی تباہ کاریوں نے پانی پت میں بیٹھے ہوئے حالی کو اس طرح بے قرار کر دیا کہ خود سیلاب زدہ شاید اتنے بے چین نہ ہوئے ہوں گے۔ مولانا احسن اللہ ثاقب نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ برسات میں وہ پانی پت گئے۔ اُس زمانے میں دو تین روز سخت بارش ہوئی۔ مولانا کی بے قراری دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کمرے میں "مضطربانہ برابر ٹہلتے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر نہایت خضوع و خشوع سے جنابِ باری میں غربا کے لیے جن کے مکان گر رہے تھے دعا کرتے۔"

۱۹۰۵ء میں مولانا حالی حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ اُس زمانے کا ایک واقعہ مولوی عبدالحق صاحب نے بیان کیا ہے۔ "ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اُس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کر دی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پرسی کی کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہوئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے 'ہائے ظالم کیا کیا' اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہیں کھایا۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہو گا۔"

لیکن اُن کی ہمدردی محض لفظی نہ تھی۔ وہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر صرف رنجیدہ نہ ہو جاتے تھے۔ بلکہ عملی طور پر جہاں تک ہو سکتا مصیبت زدوں کی مدد اور حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی کیا کرتے تھے۔ آمدنی قلیل تھی اور ذمے داریاں بہت لیکن فراخ دلی کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کوئی ضرورتمند اُن کے

پاس آیا، خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ اُن کے ملازموں کا بیان ہے کہ ضرورت مند آتا تو چپکے سے مُٹھی بند کرکے اُسے دیتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ کیا دیا۔ جن کو روپے کے بجائے کسی اور مدد کی ضرورت ہوتی اُن کی دوسری طرح مدد کرتے۔ سفارش سے کام نکال سکتے تو سفارش کرتے۔ بیمار کا علاج دوا کراتے۔ اور تیمارداری کرتے۔

لوگ مولانا حالؔی کی ہمدردی اور رحم دلی کو جلدی سے پہچان لیتے تھے اور غریب وپیشہ ور لوگ بھی اُن سے عجیب عجیب فرمائشیں کرتے تھے۔ ایک نائی کا یہ دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی محبوبہ کو رام کرنے کے لیے مولانا سے تعویذ مانگا تھا اور مولانا نے اُس کی لوگوں سے سفارش بھی کی۔

مولانا حالؔی کی زندگی میں سچّے ایثار کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ خود اُن کا کلام اُن کی سیرت کی اس اہم خصوصیت کی تفسیر ہے۔ یہ اعلیٰ صفات دراصل اس گہرے مذہبی احساس نے اُن میں پیدا کی تھیں جو حالؔی کے دل میں بچپن سے موجود تھا۔

ہم نے ابھی تک حالؔی کے مذہب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اب ہم اُن کے مذہبی خیالات پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ عقیدتاً حنفی سُنّی مسلمان تھے۔ اُنھوں نے علومِ دین کی تعلیم، کلامِ مجید کا درس، فقہ، حدیث وغیرہ کی تعلیم بڑے بڑے مسلّم عالمانِ دین سے حاصل کی تھی۔ اس لحاظ سے انھیں کٹّر راسخ العقیدہ اور کس حد تک تنگ نظر مولوی ہونا چاہیے تھا۔ نوجوانی میں اُن پر رسمی مذہب کا رنگ خاصا گاڑھا چڑھا ہوا تھا۔

لیکن اُن کے وسیع مطالعے، بے تعصّب طبیعت اور وسیع الخیال دماغ نے اور سب سے زیادہ حق کی جستجو، کلامِ الٰہی کے عمیق مطالعے اور گہرے مذہبی جذبے نے جو دین کی اصل اور اسلام کی روح جاننے کو بے چین تھا اُن میں مذہب کا وہ تصوّر پیدا کر دیا جس میں تنگ نظری، تعصّب، اور رسم پرستی کا گزر نہیں۔ اُن میں مذہب کی وہ سچی روح بیدار ہو گئی جس نے ایک طرف اپنے خالق کی بے پایاں محبت پیدا کی تو دوسری طرف انسانیت کا سچا درد عطا کیا۔

سرسیّد کی طرح حالؔی بھی رسمی اور رواجی مذہب کو جس نے اسلام کی اصلی روح اور مقصد

کو دبا دیا تھا، اسلام کے منافی اور مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ اور کتنا صحیح نکلا یہ خیال کہ اسلام کو اس رواجی قید اور بے جا بندشوں سے نہ آزاد کیا گیا تو نیا تعلیم یافتہ طبقہ مذہب ہی سے بیزار اور روگرداں ہو جائے گا۔ اس موضوع پر حالؔی نے سرسیّد کی سوانح حیات اور دو تین مضمونوں میں مفصّل روشنی ڈالی ہے۔ وہ سرسیّد کو برخلاف اس وقت کے عالموں اور مذہب پرستوں کے سچّا مسلمان، اسلام کا شیدا، پیغمبرِ اسلام کا عاشق اور مسلمانوں کا رہنما سمجھتے تھے۔ اور باوجود بعض باتوں میں اُن سے اختلاف رکھنے کے اُن کی اُن مذہبی اصلاحوں کے بڑے قدرداں تھے جو سرسیّد کر رہے تھے۔ اُن کی "تفسیر القرآن" اور "خطباتِ احمدیہ" کے بارے میں حالؔی کی رائے ہے کہ اس کی روح کو مسلمانوں نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ حالؔی کا مذہبی شعور سرسیّد سے بھی گہرا تھا۔ اور خود اُن کی ذات ایک سچّے پکّے اور روشن خیال مسلمان کی زندگی کی آئینہ دار تھی جس میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا سا خلوص، جوش، جذب، علم کی پیاس، عمل کی لگن، اسلام اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مذہبی ٹھیکے داروں نے سرسیّد کے ساتھ ساتھ انھیں بھی ملحد، نیچری، لامذہب، مخربِ اخلاق سب ہی کچھ کہا۔ اس لیے کہ حالؔی کا یہ عقیدہ تھا " اَلدِّینُ یُسْرٌ " دین آسان ہے۔ اس عنوان کے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ " دینِ برحق کی شان یہ ہے کہ اس میں کوئی چیز انسان کو مجبور کرنے والی نہ ہو۔ نہ اعتقادات میں کوئی محال بات تسلیم کرائی جائے۔ نہ عبادات میں کوئی ایسا بوجھ ڈالا جائے کہ عاجز بندوں سے اس کی برداشت نہ ہو سکے۔ خدا کی کوئی نعمت جس سے نفس یا بدن کے حق میں مضرّت کا اندیشہ نہ ہو اُن پر حرام نہ کی جائے ...... اُس میں عبادت کے طریقے ایسے عمدہ ہوں جن میں مشقّت کم اور فائدہ بہت ہو۔ اس کے اُصول ایسے جامع ہوں کہ ایک نیکی میں بہت نیکیاں مندرج ہوں۔ اس میں کوئی بندش ایسی نہ ہو جس سے انسان کو اپنی واجبی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے۔ اِس میں کوئی مزاحمت ایسی نہ ہو جس سے انسان پر ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں ......" پھر آگے چل کر فرماتے ہیں: " دینِ اسلام بھی جب اس کی اصل ماہیت

---

۱ عنوان ایک مضمون از مولانا حالؔی۔

پر نظر کی جاتی ہے تو ایسا ہی پاک دین معلوم ہوتا ہے جو انسان کی آزادی کو قائم رکھتا ہے اور اس کو کسی دشوار بات کے ماننے پر مجبور نہیں کرتا ...... قرآنِ پاک میں خدا فرماتا ہے۔ "خدا[1] تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا۔ خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ خدا نے دین میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کی ....." پھر آگے چل کر آں حضرتؐ کے اقوال دہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تھا "ہر مسلمان کو آگاہ کیا گیا کہ دانشمندی کی بات مومن کی گم شدہ پونجی ہے۔ پس جہاں کہیں اس کو ملے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے .... یہ بھی صاف صاف ارشاد ہوا کہ .... جن لوگوں نے تعصب کی طرف بلایا، تعصب کی حالت میں مرا، تعصب کی بنا پر لڑا وہ ہم میں سے نہیں ...." مروّجہ رسمی عقائد پر بڑی سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مگر افسوس ہے کہ ہمارے علما نے احکامِ ظاہری میں تعمق اور تدقیق کو اس قدر کام فرمایا کہ شریعت کا موضوع بالکل بدل گیا اور جس دین کی نسبت "الدین یُسر" (دین آسان ہے) کہا گیا تھا وہ "الدین عُسر" (دین مشکل ہے)، کہلانے کا مستحق ہو گیا .... امام شعرانی نے میزان میں لکھا ہے کہ دین میں جس قدر آسانیاں ہیں وہ خدا اور رسول کی طرف سے ہیں اور جتنی دشواریاں ہیں وہ علما کی طرف سے ہیں۔ واقعی یہ قول بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم اپنے عہد کے علما کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں ..." آخر میں اس کی دلیل دیتے ہیں کہ وہ اسلام کو سچا مذہب کیوں مانتے ہیں .... "ہم جو دنیا کے ادیان و ملل میں سے صرف دینِ اسلام کو واجب تسلیم سمجھتے ہیں .... اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف اسلام ہی خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور باقی ایسے نہیں۔ کیونکہ کلامِ الٰہی میں وارد ہے کہ .... کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی نبی نہ گزرا ہو اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ...... ہم نے بعض انبیا کا حال تجھ پر اے نبی آخر الزماں ظاہر نہیں کیا۔ پس معلوم ہوا کہ ہم اسلام کو اس وجہ سے جو اوپر مذکور ہوئی اور دینوں پر ترجیح نہیں دیتے بلکہ اس سبب سے دیتے ہیں کہ جس وقت دینِ اسلام کا ظہور ہوا اُس وقت ادیانِ سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصلیت پر باقی نہ رہا تھا۔ انسان کی افراط و تفریط سے حق اور باطل مل جل کر ایک ہو گئے تھے۔ شرک و بدعات نے

---

[1] عربی عبارت اصل مضمون میں درج ہے میں نے طوالت کے خیال سے اسے چھوڑ دیا ہے۔ صرف ترجمہ دیا ہے۔

توحید اور حُسنِ راشدی کو دبا لیا تھا۔ اور خود غرض عالموں کی تحریفات اور مقلّد جاہلوں کی جہالت اور تعصب دینداروں کے غلو سے تمام شریعتوں کے موضوع بدل گئے تھے۔ نبی آخر الزماں نے آ کر حق کو باطل سے جدا کیا اور جو کھوٹ اور ملاوٹ اگلی شریعتوں میں مل گیا تھا اس کو دور کر کے ایک خالص کندن نکالا اور اس کا نام اسلام رکھا۔ اب اگر اسلام بھی شرائع سابقہ کی طرح اپنی اصلیت پر باقی نہ رہے تو ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا دین حق ہے ...." اس پورے مضمون کو پڑھنے سے حالیؔ کے مذہبی خیالات پر بہت روشنی پڑتی ہے کہ اسلام کا کیا تصور اُن کے ذہن میں تھا۔

ظاہر ہے کہ مذہب کے ٹھیکیدار ایسی کھری کھری باتیں سننے کی کہاں تاب لا سکتے تھے جس سے اُن کے خود ساختہ مذہبی اصولوں کی عمارت گر جانے کا خطرہ تھا۔ اُن کی کسوٹی پر تو وہ شخص پورا اتر سکتا تھا جو اُن کے من گھڑت مذہبی قاعدوں پر آنکھ بند کر کے ایمان لائے۔ لیکن حالیؔ زندگی کے ہر شعبے میں مقلّد نہیں مجتہد تھے۔ انھیں کبھی اس کی پروا نہیں ہوئی کہ سچائی کے اظہار پر لوگ اُن کو کیا کہتے ہیں کیا نہیں۔ مذہب کے معاملے میں بھی اُن کا یہی شعار تھا۔

لیکن باوجود پکے مذہبی خیالات کے ہونے کے وہ تمام دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے۔ لیکن مذہب کو محض عقیدتاً مان لینا اُن کے نزدیک کافی نہ تھا۔ وہ مذہب میں بھی غور و فکر، تحقیق و جستجو کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ یہی قرآنِ پاک کا فرمان بھی ہے کہ آنکھیں بند کر کے مذہب کو ماننا دل سے ماننا نہیں جب تک انسان خود اس کو سمجھ بوجھ کر اختیار نہ کرے۔ حالیؔ کے نزدیک مذہب کی بہت اہمیت ہے مگر اس مذہب کی جو سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے۔

پانی پت کے ایک نوجوان نے جو حالیؔ کی برادری سے تعلق رکھتے تھے، اپنے ماں باپ سے ناراض ہو کر اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی تمنا میں عیسائی مذہب اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حالیؔ کو اس کی خبر ہوئی تو بہت افسوس ہوا۔ صرف اس لیے نہیں کہ ایک مسلمان ترکِ دین کر رہا ہے۔ یقیناً اس کا بھی انھیں قلق تھا مگر افسوس یہ تھا کہ اس کا ارادہ طلبِ حق اور سچائی کی جستجو کی خاطر نہیں بلکہ اپنا مدعا ایک ذلیل طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ اُنھوں نے اس نوجوان کو جو خط لکھا وہ بہت طویل ہے اس کے دو ٹکڑے یہاں درج کیے جاتے ہیں جن سے حالیؔ کی اس معاملے

میں جو رائے تھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

"اگر بالفرض تم نے اسلام میں کوئی نقص یا عیب معلوم کیا ہے اور عیسائی مذہب کو سب مذہبوں سے بہتر پایا ہے اور مذہبی تحقیقات کے جتنے مراتب ہیں وہ سب طے کر لیے ہیں اور بالکل تمھارے دل میں شک و شبہ نہیں رہا تو بھی تم کو اپنا مذہب چھوڑنے میں اور دوسرا مذہب اختیار کرنے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ حالانکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں تم نے مذہبی تحقیقات کی الف، ب، ت بھی نہیں پڑھی اور میرے نزدیک تم ہرگز اس وجہ سے عیسائی مذہب اختیار نہیں کرتے کہ تم نے اسلام کو برا مذہب اور عیسائیت کو اچھا یقین کر لیا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تم کو انگریزی تعلیم کا شوق ہے اور اس کو حاصل کرنے کا مقدور نہیں اس لیے تم نے یہ ذلیل و نامراد تجویز سوچی ہے۔ ......" پھر آخر میں لکھتے ہیں "اگر فی الواقع تم کو دینِ اسلام میں کچھ شبہات ہیں، ایک آدھ روز کے لیے یہاں چلے آؤ — ہمارے ہاں ٹھہرنا اور اپنے شبہات بیان کرنا۔ اگر اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو پھر تم کو اختیار ہے چاہو مزید تحقیقات کرنا، چاہے ترکِ مذہب کرنا......

حالی نے اس نوجوان کے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی۔ غالباً وہ اس خط کے بعد حالی کے پاس آئے اور حالی نے ان کی تشفی کر دی اور بعد میں اغلباً حالی کی ہی مدد سے انھوں نے اپنی آئندہ تعلیم جاری رکھی اور پھر شاید کبھی ترکِ مذہب کا خیال ہی اُن کے ذہن میں نہیں آیا۔

اس واقعے سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھیں دوسرے مذاہب سے تعصب نہ تھا، ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُن کی نظر میں مذہب کی بہت بڑی اہمیت تھی اور وہ دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے کو اس کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے۔ اور اُن لوگوں کو ذلیل جو دنیا کے لیے دین کو بیچ ڈالتے ہیں۔

وہ حنفی المذہب سنّی تھے لیکن اہلِ بیتِ اطہار سے اور جناب علی مرتضےٰ سے انھیں بڑے بڑے شیعوں سے زیادہ عقیدت تھی۔ ان کا یہ شعر اس احترام اور عقیدت کا پورا ثبوت دیتا ہے ؎

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

پانی پت میں صرف اُن کے خاندان کے شیعہ حضرات ہی نہیں بلکہ شہر بھر کے شیعہ اُن کے

مذہبی عقیدے کی بھی اُسی طرح عزت کرتے تھے جس طرح ان کی ذات کی۔ جب حالی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنّیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا ہی کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔

آں حضرتؐ سے حالی کو وہ گہری عقیدت اور والہانہ عشق تھا جس کا ثبوت ہر اُس شعر سے مل سکتا ہے جو انھوں نے ہادیِ برحق کی شان میں کہا ہے۔ انھوں نے جہاں کہیں اس موضوع پر لکھا ہے قلم توڑ دیا ہے۔ "مسدس حالی" کے چند نعتیہ بند اردو شاعری کے سارے نعتیہ کلام پر بھاری کہے جا سکتے ہیں ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
غریبوں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

اور اسلام کی تعلیم کی بنیاد وہ انسانیت کی محبت اور خدا کی مخلوق کی خدمت کو سمجھتے تھے ؎

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

ایک جگہ لکھتے ہیں "میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ہو سکے سلوک اور بھلائی کی جائے......"

مذہب کی یہی سچی روح تھی جس نے حالی کے دل میں انسانی ہمدردی، خلوص، بے تعصبی، عالی ظرفی،

ایثار اور درد کی وہ انمول صفات پیدا کر دی تھیں جو انسانیت کا زیور اور جوہر ہیں۔ اور حالیؔ کی ساری زندگی اور سارے کارنامے اس کا مظہر بن گئے۔ میر دردؔ کا یہ مصرعہ گویا حالیؔ کے دل کی آواز تھا ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

اور خود ان کا یہ مسلک تھا کہ ؎

چیست انسانی؟ تپیدن از غمِ ہمسایگاں
از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن

سرسید کی طرح حالیؔ کو بھی قوم نے خوب خوب قومی خدمتوں کے انعام دیے۔ وہ سرسید کے دوست اور ساتھی ہونے کی وجہ سے ایک تو یونہی موردِ ملامت تھے اور "نیچری" کہے جاتے تھے جس کی وجہ سے جیسا کہ پہلے ہم نے لکھا مذہبی حلقہ اُن سے ناراض تھا۔ پھر انھوں نے شاعری میں ایک نئی راہ نکالی۔ حُبّ وطن، برکھارت وغیرہ قسم کی نظمیں کہیں جو عام مذاق سے الگ تھیں (اور عوام ہر نئی چیز سے بدکتے اور چڑتے تھے) اور پھر "مسدس حالیؔ" میں "شعر و قصائد کے ناپاک دفتر" کے پول کھولے اور یاوہ گو شاعروں کی شان میں کہا ؎

یہ ہجرت جو کر جائیں شاعر ہمارے کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سارے

ان سب باتوں کی وجہ سے انھوں نے ادب و شاعری کے خود ساختہ علم برداروں سے مخالفت مول لے لی۔ اور پھر "مقدمۂ شعر و شاعری" نے تو آگ ہی لگا دی۔ خصوصاً لکھنؤ والے جو اس وقت اپنی کنگھی چوٹی کی شاعری کو سرمایۂ کائنات سمجھتے تھے بھڑک ہی تو اٹھے۔ ہر طرف اعتراض، نکتہ چینی اور لعن طعن کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ حالیؔ کے پاس پچاسیوں خط گالی دشنام سے بھرے ہوئے آتے۔ اخباروں میں ان کے خلاف مضامین لکھے جاتے۔ "اودھ پنچ" ان میں سب سے پیش پیش تھا۔ مدت تک اس میں "مقدمہ" کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ ان مضامین میں صرف جا بے جا اعتراض ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ پھبتیوں اور پھکڑ پن سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ خالی۔ خیالی۔ ڈفالی نامی حریف حالیؔ سے مقابلے کے لیے میدان میں اتارے گئے اور ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

اور ....

دِلّی دِلّی کیسی دِلّی پانی پت کی بھیگی بلّی

جیسے فقروں اور شعروں کے حربے استعمال کیے گئے۔

حالیؔ سب کچھ پڑھتے، سنتے اور سہتے رہے۔ نہ خود ان لایعنی باتوں اور متعصبانہ اعتراضوں کا کوئی جواب دیا نہ کسی دوسرے کو دینے دیا۔ ایک مرتبہ خواجہ غلام الحسنین مرحوم نے اور دو ایک مرتبہ حالیؔ کے اور دوستوں نے اُن سے اصرار کیا کہ ہمیں اُن کا جواب لکھنے کی اجازت دیجیے مگر حالیؔ نے انھیں منع کر دیا اور کہا تو حیرت سے صرف یہ ؎

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالیؔ پہ نچوڑ! شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

یہی نہیں کہ صرف پھکڑ اور مسخرے اخبار اور سطحی مذاق کے لوگ حالیؔ کے خلاف تھے بلکہ بعض معقول اخبار اور رسالے اور پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بھی اُن کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ایک تو لکھنؤ کے اہلِ زبان کو یہ بات بڑی کھلتی تھی کہ پانی پت جیسے چھوٹے سے قصبے کا ایک شخص "اہلِ زبان" کے منہ آئے، اُن کی اصلاح کی کوشش کرے، ان کو مشورے دے اور یہی نہیں بلکہ زبان تک کے معاملے میں بھی اُن کے اشعار اور ادب کو سند نہ مانے بلکہ خود اس میں اجتہاد کرے اور طرح طرح کی "بدعتیں" کرتا رہے اس لیے یہ ادب کے خود ساختہ ٹھیکیدار حالیؔ، اس کی زبان، اس کے کلام اور بیان پر طعن، اعتراض کرتے پھبتی کستے اور اس کی ذات تک کو مطعون کرتے رہے۔ لیکن اُن میں[1] مخالفت سہنے کا عجیب و غریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ جواب دیتے تھے مگر حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا مگر ضبط سے کام لیتے تھے۔

مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں علیگڑھ سے "اردوئے معلیٰ" جاری کیا اور مولانا حالیؔ پر

---

[1] چند ہم عصر از مولوی عبدالحق۔

اعتراضات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھیڑ دیا۔ حالی کے پاس رسالہ باقاعدہ آتا تھا اور وہ اُسے پڑھتے تھے مگر کبھی جواب نہیں دیا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے یوں بیان کیا ہے۔

"علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور حسبِ معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے میں سے حسرت کو دیکھا۔ اُن میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلّٰی کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرت اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں۔ اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کرکے حسرت اور اردوئے معلّٰی کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے .... کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ خوب لکھا ہے کہہ کر داد دیتے .... حالی بھی ہوں، ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے......

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کرکے بولے " ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے۔ اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اُردو کی خدمت سے روک لیں اُتنا ہی اچھا ہے۔ فرشتہ منش حالی ذرا مکدّر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاح زبان کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔"

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا اب بھی حالی کے خلاف کچھ لکھو گے؟ جواب دیا جو کچھ لکھ چکا اُسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔ حالی کا یہ ضبط، وقار اور عالی ظرفی بڑے بڑے مخالفوں کو شرمندہ اور نکتہ چینوں کو پشیمان کر دیتی تھی۔

لعن وطعن، گالی، دشنام، طنز و اعتراضات کے طوفان کو حالی نے ایک نرالے

طریقے سے زیر کیا ہے

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ   سب کچھ کہا انھوں پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے، مخالفت کا یہ طوفان جو خس و خاشاک کی کائنات تھا، جلد ہی دب گیا اور حالی کی عظمت اور شان اپنی جگہ قائم رہی۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

حالی زیادہ تر قوم کے موردِ عتاب اس لیے تھے کہ وہ سر سید کے صرف ہم خیال ہی نہ تھے بلکہ اپنے قلم سے اُن کی اور اُن کی تحریک کی پورے زور اور قوت کے ساتھ حمایت کرتے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں وہ سر سید سے ملے تھے اور اُن کی شخصیت کا اور اس اصلاحی تحریک کا جو وہ علی گڑھ کالج کے ذریعے چلانا چاہتے تھے حالی کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا تھا اور اس کے بعد سے تقریباً چالیس ہی سال ان کا علی گڑھ کی تحریک سے تعلق رہا اور وہ سر سید کے کاموں میں شریک، مشیر، ساتھی اور معاون رہے۔ زبان سے، قلم سے، ہاتھ پاؤں سے، پیسے سے، ہر طرح علی گڑھ کالج کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پہلی بار ہی جب وہ علی گڑھ گئے اور مدرسۃ العلوم کو دیکھا تو اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ ایک مضمون میں اس کا ذکر یوں لکھا ہے:-

ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس وعظ میں حاضر ہوئے ہیں، ہم نے اونچے اونچے منبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں، ہم حال اور قال کی مجالس وعظ میں بھی شریک ہوئے ہیں، ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرے سنے ہیں مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسے کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی۔ بلا تشبیہہ جو شعر ظہیری نیشاپوری نے بیت اللہ شریف کی زیارت کے وقت پڑھا تھا وہ اس مدرسے کو دیکھ کر ہم کو یاد آیا ہے

"ایں کعبہ را بنا نہ بہ باطل نہادہ اند   صد معنی و جمال دریں گل نہادہ اند"

یہ الفاظ محض کسی ادیب کی لسانی یا شاعر کا مبالغہ نہیں بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے اس دردمند کا دل اس مدرسے کو دیکھ کر جسے وہ مسلمانوں کی ترقی و بہبود کا سنگِ بنیاد سمجھتا

تھا فخر و مسرّت سے جھوم اُٹھا ہے۔ اور یہ باتیں اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں۔ اس دن سے لے کر آخری دم تک وہ علی گڑھ اور مدرسۃ العلوم کی خدمت میں لگے رہے۔ ان کا اصل کام ادب و شاعری کے ذریعے اس مدرسے کو مقبول بنانا تھا۔ مگر حالؔی نے محض قلمی خدمت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی وہ جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے۔ سرسیّد کے ساتھ (اور ان کی وفات کے بعد بھی) کالج کے لیے چندہ کرنے اور اس کو ملک سے متعارف کرانے کی خاطر بڑے بڑے سفر کرتے رہے۔ اس کے لیے اپنے وطن سے اور اُس کے اطراف سے چندے جمع کیے، اپنے خاندان کے اور وطن کے بہت سے نوجوانوں کو علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا، اور اپنے بیٹوں اور نواسوں وغیرہ کو ہمیشہ علی گڑھ کی خدمت کرنے کے لیے اُبھارتے رہے۔ وہ کالج کے ٹرسٹی بھی تھے اور ہمیشہ انھوں نے ٹرسٹی کے فرائض پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دیے۔ اس عرصے میں بارہا کالج میں اختلاف اور تنازعات ہوئے، کبھی سرسیّد اور ٹرسٹیوں کے درمیان کبھی حکومت اور علی گڑھ کالج کے بعض ہمدردوں کے درمیان اور کبھی خود باہم ٹرسٹیوں میں، مگر حالؔی نے ان موقعوں پر ہمیشہ جس بات کو حق اور کالج کے مفاد میں بہتر سمجھتے تھے اس کی حمایت کی۔ سرسید کی اُن کے دل میں بڑی محبت تھی لیکن حق کی محبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ ۱۸۹۷ء میں سرسیّد یورپین اسٹاف کے اصرار پر سیّد محمود کو اپنا جانشین یعنی کالج کا آئندہ سیکریٹری بنانا چاہتے تھے۔ بعض لوگ اِسے کالج کے حق میں مفید نہیں سمجھتے تھے کہ اس طرح گویا اپنا جانشین مقرر کرنے کی رسم پڑ جائے گی اور جمہور کو اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا حق حاصل نہ رہے گا۔ حالؔی بھی اسے درست نہیں سمجھتے تھے۔ سیّد محمود سے اُن کی پُرانی دوستی اور بڑے مراسم تھے۔ خود سیّد محمود جن کا سر کبھی کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے نہیں جھکا حالؔی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اُن کا یہ قول ان کی اس عزت و محبت پر دال ہے جو سر راس مسعود نے بیان کیا ہے کہ سیّد محمود نے ایک بار سرسیّد سے کہا "ابّا جانی اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے گا کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے اُن میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لیے تیرا دل تیار ہو جائے تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالؔی ہے......" لیکن اس قدر گہرے تعلقات کے باوجود

حالؔی اس معاملے میں سرسیّد سے متفق نہ تھے۔ لیکن اسی زمانے میں سرسید وفات پا گئے اور معاملہ جوں کا توں رہ گیا۔ پھر تھوڑے عرصے سکریٹری رہنے کے بعد سیّد محمود بھی خدا کو پیارے ہوئے اور سکریٹری کا عہدہ نواب محسن الملک کو ملا۔ ۱۹۰۴ء میں محسن الملک کے زمانے میں بھی انگریز حاکموں کا تسلّط بڑھنے لگا اور بدیسی حکومت کالج کے معاملات پر حاوی ہونے لگی اور وہ بعض مصلحتوں کی بنا پر خود اس کی طرف جھک گئے۔ لیکن نواب وقار الملک بعض دیگر صاحب الرائے ٹرسٹی اور خود حالؔی اِسے کالج کے حق میں بہت مضر جانتے تھے۔[1] تجویز یہ تھی کہ مسٹر کارنا کو جو بڑا بدزبان اور جابر شخص تھا کالج کے موجودہ پرنسپل مسٹر ماریسن کا جانشین نامزد کر دیا جائے۔ اس سے ایک طرف تو ایک ناموزوں شخص کالج کا پرنسپل بن کر اس کا مختارِ کل بن جاتا دوسری طرف ٹرسٹیوں کے اختیارات پر ضرب پڑتی اور پرنسپل منتخب کرنے کا حق گویا اُن سے چھین لیا جاتا۔ نواب وقار الملک نے اس معاملے کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں حالؔی کو لکھا ہے:-

"جو کوشش اس اہم مسئلے کے متعلق جناب نے فرمائی اور فرما رہے ہیں وہ کچھ نئی نہیں ہے۔ کالج اور قوم دونوں اس کے ہمیشہ مشکور رہے ہیں۔ لیکن ایک خاص مضمون بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر جناب سرسیّد مرحوم و مغفور ایک مہینے بھی اور زندہ رہتے تو جناب اور نواب محسن الملک اور خاکسار کے دستخطوں سے ایک یادداشت ٹرسٹیوں میں جاری ہو چکی تھی کہ کالج کی خبر لیں اور اس کو یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں چلے جانے سے روکیں۔

میں جواب کی مرتبہ علی گڑھ گیا تھا تو نواب محسن الملک بہادر کو میں نے وہ واقعہ یاد دلایا جس سے میری غرض یہ تھی کہ ایک تو وہ وقت تھا کہ جب وہ اس مقصد کے واسطے سرسیّد کی بھی پروا نہ کرتے تھے یا آج یہ دن ہے کہ خود اس سے زیادہ غلطیاں کر رہے ہیں......"

حالؔی اس معاملے میں بہت فکر مند تھے۔ ایک طرف اُنھیں یہ فکر تھی کہ محسن الملک بد دل ہو کر علی گڑھ سے علیحدہ نہ ہو جائیں، اس لیے کہ اس وقت ان سے زیادہ قابل، ہمدرد اور مخلص آدمی ملنا

---

[1] مارلیسن کارنا کو اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتے تھے۔

دشوار تھا۔ دوسری طرف انگریزوں کا یہ تسلّط کالج کے مستقبل کے لیے وہ فال بد جانتے تھے۔ وقار الملک کو اس کے بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب کی نسبت مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ وہ مسٹر ماریسن اور نواب محسن الملک کے خلاف کوئی کام نہ کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولوی نذیر احمد بھی کوئی مستقل رائے رکھنے والے آدمی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر سب ٹرسٹیوں سے جو دہلی میں ہیں امید ہے کہ وہ آپ کے ساتھ اتفاق کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے محمد کرم اللہ خاں صاحب کے خط میں یہ لکھا ہے کہ علاوہ اور خرابیوں کے جو مسٹر کارنا کے پرنسپل ہونے سے پیدا ہوں گی دو اور نہایت مضر نتیجے پیدا ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ آئندہ ٹرسٹیوں کو یہ اختیار باقی نہ رہے گا کہ وہ کسی نئے پرنسپل کو اپنی رائے اور اختیار سے مقرر کریں کیونکہ اگر اس وقت مسٹر ماریسن کی تجویز کامیاب ہو گئی تو پھر ہمیشہ کو ہر پرنسپل کا یہ واجبی حق ہو جائے گا کہ اپنے جانشین کو خود تجویز کرے۔ دوسرے قوی اندیشہ ہے کہ کارنا کی بد زبانی سے بہت سے عزت مند لڑکے کالج چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

اس معاملے کے متعلق خواجہ سجّاد حسین کو بھی بہت سے خطوں میں اپنی رائے لکھی اور خطروں کا اظہار کیا ہے جو وہ سمجھتے تھے کہ درپیش ہوں گے۔ ایک خط کا اقتباس ہے :-

"میں نے ان تمام رزولیوشنوں سے جو آنریری سکریٹری اور لوکل ٹرسٹیوں نے مرتب کیے ہیں اتفاق کیا ہے لیکن مجھے توقع نہیں ہے کہ سب رزولیوشن کثرتِ رائے سے پاس ہو جائیں۔ زمیندار و تعلقداران و عہدہ دارانِ سرکاری اور ان کے علاوہ بعض دیگر اصحاب بھی محض ایک وہمی خیال، اندیشۂ ناراضی "ہز آنر"[1] کالج کی بنا پر یقیناً اختلاف کریں گے۔ اور اگر مخالفین کی رائے غالب ہو گئی تو لوگوں کو سخت اندیشہ ہے کہ آنریری سکریٹری استعفا نہ دے دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر تمام رزولیوشن کثرت رائے سے پاس ہو گئے تو مسٹر آرچبولڈ استعفا دیے بغیر نہ رہیں گے اور اس موقع پر اُن کا استعفا دینا انگریز افسروں اور حاکموں پر بڑا اثر ڈالے گا۔ لیکن پہلا اندیشہ

---

[1] یہ اشارہ غالباً یو۔پی کے لیفٹیننٹ گورنر کی طرف ہے جو کالج کا سرپرست ہوتا تھا۔

دوسرے اندیشے سے میرے نزدیک زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ اگر "ہز آنر" کے مشورے مان لیے گئے جن کے قبول کرنے سے عذر کیا گیا ہے تو سکریٹری بلکہ تمام ٹرسٹیوں کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا اور محمڈن کالج بمنزلہ ایک گورنمنٹ کالج کے ہو جائے گا۔" اور حالی اس کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے کہ علی گڑھ کالج کو گورنمنٹ کالج بننے دیں۔ انھیں ٹرسٹیوں کے حقوق اور اختیارات کی بڑی فکر تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کا احساس بھی تھا کہ ٹرسٹی جیسا چاہیے ویسی تہذیبی، دیانت داری اور خلوص سے کالج کی خدمت انجام نہیں دیتے۔ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کالج کے طلبا نے پرنسپل کے خلاف اسٹرائک کی تھی۔ اس کے بارے میں مولوی عبدالحق نے ایک مضمون "پیسہ اخبار" میں لکھا جس کو حالی نے بہت پسند کیا۔ انھیں لکھتے ہیں: "سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اس باب میں کمیشن کے پریسیڈنٹ صاحب کو لکھ بھیجا ہے کہ نکمّے اور نالائق ٹرسٹیوں کی بھرتی جو دراصل سرسیّد کے وقت سے شروع ہوئی تھی؛ انھوں نے کالج کی وقعت بڑھانے کے لیے اور نیز اس لیے کہ ان کے دوراندیشانہ منصوبے بغیر کسی اختلاف کے پورے ہوتے رہیں، ایسے لوگوں کو کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر بنایا تھا جن سے مالی امداد کی توقع ہو یا جو قوم میں کسی وجہ سے شہرت رکھتے ہوں اور سکریٹری سے کسی معاملے میں اختلاف کرنے کا نہ ان میں مادّہ ہو نہ ارادہ۔ پھر بعد میں جب ٹرسٹی بل پاس ہوا تو وہی لوگ ٹرسٹی مقرر کیے گئے اور آج تک اسی اصول پر ٹرسٹیوں کا انتخاب ہوتا رہا۔ میں نے ان کو یہ بھی لکھا ہے کہ کمیشن کو چند رزولیوشن ایسے بھی پاس کرنا چاہئیں جن سے موجودہ ٹرسٹیوں کی غفلت و بے پروائی کا انسداد اور آئندہ کسی عمدہ اور مستحکم اصول سے ان کا انتخاب عمل میں آیا کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" حالی کی اس رائے پر اگر عمل درآمد کیا جاتا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں وہ تاریک سال نہ آئے ہوتے جن کی بدولت اس کی گزشتہ نیک نامی پر حرف آیا۔ حالی کالج کو انگریز حکّام یا چند اُمرا و رؤسا کی ملکیت بنا دینے کے مخالف تھے اور اُسے قوم کی امانت سمجھتے تھے جس کی باگ ڈور قوم کے مخلص اور قابل لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔

محسن الملک کی وفات کے بعد جب نواب وقار الملک کالج کے سکریٹری ہوئے اس وقت بھی حالی کی علی گڑھ کالج سے دلچسپی اور ہمدردی اور اس کی اصلاح کی کوشش جاری رہی اور وہ اس کی ہر

ممکن خدمت انجام دیتے رہے۔

حالؔی اور سرسیّد کے خیالات تعلیم کے بارے میں بہت کچھ ملتے ہوئے ہیں مگر ایک مسئلہ ایسا ہے جس سے حالؔی کو سرسیّد سے بھی زیادہ دلچسپی تھی یعنی عورتوں کی تعلیم۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سرسیّد عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے لیکن ان کو زیادہ فکر یہ تھی کہ قوم کے مرد پڑھ جائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مرد پڑھ جائیں گے تو عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ خود ہی حل ہو جائے گا۔ لیکن حالؔی کی نظر میں عورتوں کی تعلیم کی اہمیت بہت تھی۔

انھوں نے صرف مردوں ہی کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ اُس زمانے میں جب عورتوں کو تعلیم دلانا عیب اور گناہ سمجھا جاتا تھا، اُن کے حقوق کے اور اُن کی تعلیم کے حق میں آواز بلند کی۔ حالؔی شاعر اور ادیب تھے۔ اُن کا کام قلم کے ذریعے اور شعر کی شکل میں اپنے خیالات لوگوں تک پہنچانا تھا اور انھوں نے اس کام کو بھی بڑی خوبی سے اور بڑے اثر آفریں انداز میں انجام دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بس بھر عملی طور پر بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے خاندان کی عورتوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ لکھنا اُس وقت عورت کے لیے سخت عیب کی بات سمجھی جاتی تھی۔ میری والدہ سنایا کرتی تھیں کہ بچپن میں انھیں پڑھنا تو آ گیا تھا لیکن لکھنا سیکھنے کی اجازت نہ تھی اور چونکہ اُن کے والد اپنی ملازمت پر رہتے تھے اور دادا دوسرے گھر میں اس لیے گھر میں قلم دوات تک نہ تھی۔ دوپہر کو جب دادی سو جاتیں تو وہ توے کی سیاہی گھول کر اور سرکنڈے کا قلم بنا کر چھپ چھپ کر کسی کتاب کی عبارت نقل کرتیں اور اس طرح انھوں نے لکھنا سیکھا۔ ایک مرتبہ اُن کی دادی نے دیکھ لیا بہت خفا ہوئیں اور مولانا حالؔی سے شکایت کی۔ وہ پوتی کا یہ شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے انھیں قلم، دوات، قلم دان اور تختی وغیرہ منگا دی اور اُن کی دادی کو سمجھایا کہ عورتوں کے لیے لکھنا معیوب نہیں بلکہ ایک مفید ہنر ہے۔

ایک خط میں خواجہ سجّاد حسین کو اُن کی چھوٹی بچّی کے بارے میں لکھتے ہیں: ”مسرورہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کارڈ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ جب کبھی خط یا کارڈ یا مشق کے طور کچھ لکھیں پنسل سے کاغذ پر

خط کھینچ دینے چاہئیں تاکہ اُن کی سیدھی سطر لکھنے کی عادت ہو۔ اس زمانے میں خوش نویسی اسی کا نام ہے کہ سطر بندی اور رُخ اور کُرسی درست ہو۔ لکھتے لکھتے خط خود بخود ایک صورت پکڑ لے گا۔ کبھی کبھی حساب کے سوالات بھی اُن سے کرانے چاہئیں اور دونوں (بہنوں) کے پاس سلیٹ اور پنسل ہونی چاہیے۔“

۱۸۹۴ء کے لگ بھگ انھوں نے پانی پت میں اپنے گھر سے ملے ہوئے ایک مکان میں لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا اسکول بھی کھولا تھا۔ یہ اسکول چوتھی جماعت تک کا تھا۔ اور اُن کے عزیزوں اور دوستوں کی لڑکیاں اُس میں پڑھتی تھیں۔ انھیں اسکول کی ترقی کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے آرام کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ ایک خط میں لکھا ہے۔ ”لڑکیوں کے مدرسے کے لیے ایک پنکھا تیار ہونا چاہیے اور ایک لڑکا پنکھا کھینچنے کے لیے نوکر رکھنا چاہیے ورنہ برسات کا موسم اُس تنگ مکان میں مشکل سے کٹے گا، اور اگر ممکن ہو تو صبح سات بجے سے بارہ یا گیارہ بجے تک کا وقت بہت مناسب ہے۔ کیونکہ بڑی لڑکیاں جو گھر کا کاروبار کرتی ہیں اُن کا بڑا حرج ہوتا ہے۔“

اس اسکول میں دلّی کی ایک اُستانی پڑھاتی تھیں۔ اُس زمانے میں اچھی اُستانی تلاش کرنا بے حد مشکل تھا۔ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جاننے والی عورت مل جائے وہی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ خدا جانے کتنی تلاش کے بعد یہ اُستانی دستیاب ہوئی تھیں۔ ۱۸۹۸ء میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اُن سے درخواست کی کہ ایک اُستانی کہیں سے بھیجیے۔ انھیں جواب میں لکھتے ہیں: ”پانی پت میں لے دے کر ایک دلّی کی رہنے والی معلّمہ ہے۔ سجّاد حسین نے پانی پت میں ایک مدرسۂ نسواں قائم کرکے مشاہرہ دس روپے ماہوار اس میں نوکر رکھا تھا۔ آٹھ دس مہینے میں شاگردیں اُستانی کے برابر ہو گئیں بلکہ بعضی اُس سے بھی بڑھ گئیں ...... یہ حال اُس کی استعداد کا ہے ......“ غالباً کوئی مناسب اُستانی نہ مل سکنے کے سبب چند سال بعد یہ اسکول بند ہو گیا تھا۔

نظموں میں حالؔی نے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے اور اس انداز سے کی ہے کہ سیدھی دل میں اتر تی چلی جاتی ہے۔ ”چُپ کی داد“ میں کس طرح ان حق تلفیوں کا ذکر کرتے ہیں جو صدیوں سے عورت کے ساتھ ہوتی آرہی ہیں۔ ؎

افسوس دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا — حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا

اور انھیں علم کی دولت سے محروم رکھنے پر اُن کا دل تڑپ اُٹھتا ہے ؎

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات　　ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر
آیا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب　　دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب　　تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق　　تعلیم پا کر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں

بیوہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی اور مظالم اور عقدِ ثانی نہ کرنے کی رسم کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے انھوں نے بیوہ کے جذبات کی ترجمانی جس دل گداز انداز میں کی ہے وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ایسی پُراثر نظم شاید ہندوستان کی کسی زبان میں نہ ہوگی۔ جیسی "مناجاتِ بیوہ" ہے۔

ایک دوسری جگہ لڑکیوں کی شادی کے بارے میں لکھا ہے ؎

جاہلیت کے زمانے میں یہ تھی رسمِ عرب　　کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اُسے گود سے لے کر ماں کی　　گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن　　جو کہ اندھے ہیں ہیے کے نہیں کچھ ان کو خبر
لوگ بیٹی کے لیے ڈھونڈتے ہیں جب پیوند　　سب سے اوّل انھیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر
ایسے گھر بیاہیے بیٹی کو جو ہو آسودہ　　اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو؟　　پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر
بد مزاجی ہو، جہالت ہو کہ ہو بد چلنی　　کچھ برائی نہیں ذو تونتا ہے داماد اگر
یہ وہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن　　بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر
اپنا اور بیٹیوں کا جب کہ نہ سوچیں انجام　　جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

عورتوں کی تعلیم اور بچوں کی پرورش اور تربیت کے اصولوں پر مولانا حالیؔ نے ایک کتاب

قصّے کے پیرائے میں مجالس النساء کے نام سے لکھی ہے جس میں تعلیم و تربیت کے اصول نہایت سادہ دل نشیں اور دلچسپ انداز میں بتائے گئے ہیں۔ اس کتاب پر پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیم نے چار سو روپے کا انعام محکمۂ تعلیم کی طرف سے دیا تھا، اور سالہا سال تک یہ پنجاب کے لڑکیوں کے نصاب میں داخل رہی۔ چند سال پہلے تک عورتیں اور لڑکیاں اِسے بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھتی تھیں۔

مولانا حالیؔ کی سیرت کی ایک اور اہم خصوصیت اُن کی بے تعصبی ہے۔ وہ ہر قوم اور ہر فرقے کے لوگوں سے ایک سی محبّت اور سلوک سے پیش آتے تھے۔ اُس زمانے میں مسلمانوں میں انگریزوں سے بہت تعصّب اور چھوت چھات برتی جاتی تھی لیکن مولانا کے بعض انگریزوں سے بھی بہت خوش گوار تعلّقات تھے، اور ہندوؤں میں تو اُن کے بیسیوں دوست تھے۔ محبت میں، ہمدردی میں، سفارش میں، سلوک میں کبھی انھوں نے یہ امتیاز نہیں کیا کہ یہ شخص مسلمان ہے یا ہندو۔ اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ ایسی ہی محبّت اور خلوص کا سلوک کرتے تھے جس طرح مسلمانوں کے ساتھ۔

اپنے بیٹے کو ایک صاحب کی سفارش کر کے لکھتے ہیں "وہ ہمارے شفیق دوست لالہ تلسی رام صاحب ساہوکار کے نہایت قریب کے رشتے دار ہیں۔ اُمید ہے کہ عنقریب معائنے کے موقعے پر وہ تم سے ملیں گے۔ چونکہ تم اُن سے واقف نہ تھے اس لیے تلسی رام صاحب کی یہ خواہش تھی کہ لالہ بنارسی داس کے حال سے تم کو مطّلع کر دیا جائے تاکہ تم اُن سے عزیز ہموطنوں کی طرح ملو۔۔۔۔"

لالہ چندو لال کو اُن کے والد کی وفات پر تعزیت کے خط میں لکھا ہے:

"عزیزی و شفیقی سلمہ اللہ۔ آپ کی تحریر سے میرے دلی دوست بہاری لال مشتاقؔ کی وفات کا حال معلوم ہوا جس کا صدمہ کبھی دل سے فراموش نہیں ہو سکتا۔ میرے دہلوی دوستوں میں سے افسوس ہے کہ ایک خالص اور مخلص دوست کم ہو گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ ایسے وضعدار، محبّت کے پتلے حاضر و غائب یکساں، اور اپنے اصول کے فدائی کم ہوتے ہیں۔"

وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے اور جو لوگ آپس میں مخالفت اور منافرت پھیلانا چاہتے

انھیں ملک و قوم کا سخت دشمن سمجھتے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ "جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، برہمو ہوں یا آریا"۔

رسالہ "اتحاد" لکھنؤ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہوسکتا کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی اور یکجہتی کے روابط مستحکم نہیں ہوسکتے۔ بے شک بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہوگئے ہیں جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے...... بغیر اتفاق اور یکجہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں عزت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے"۔ ایک مضمون "ہمدردی" میں برادرانِ وطن کی تہذیب کی تعریف دیکھیے۔ "ہندوستانیوں سے عموماً دو قومیں مراد لی جاتی ہیں۔ ایک ہندو دوسرے مسلمان، یہ دونوں اپنے اپنے وقت میں شائستگی کے اعلیٰ درجے کو پہنچ چکے ہیں۔ ہندوؤں کی شائستگی اس وقت میں مانی گئی ہے جب کہ تمام دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہومر شاعر نے اس زمانے کے یونانیوں کا حال مفصل لکھا ہے جب کہ منو کا مجموعہ تالیف ہوا۔ اس زمانے میں جو حال ہندوستان اور یونان کا تھا اس کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو اگرچہ ہمت و دلاوری میں یونانیوں کے برابر نہ تھے مگر عام تہذیب اور شائستگی اور قوانین کی عمدگی اور انتظام کی خوش اسلوبی اور علم و ہنر کی ترقی میں یونانیوں سے بہت بڑھ کر تھے......"

کبھی بڑی کشادہ دلی سے اُن کے کارناموں کی تعریف یوں کرتے ہیں:

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی — خود اقبال ہے آج اُن کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی — زمانے کے ساتھی ترقی کے حامی

نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ — گرامی ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادات و اطوار میں وہ — نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ

نہ پیشے سے حرفت سے انکار اُن کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار اُن کو

اور تعصب کو حالی کس نظر سے دیکھتے تھے؟

تعصب کہ ہے دشمنِ نوعِ انساں — بھرے گھر کیے سینکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزمِ نمرود جس سے پریشاں — کیا جس نے فرعون کو نذرِ طوفاں
گیا جوش میں بولہب جس کے کھویا
ابوجہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

اتحاد کی برکت سنیے!

ملک ہیں اتحاد سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا گر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

اردو ہندی کا قصہ مولانا حالی کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ حالی اردو کے نقاد، ادیب شاعر اور اردو کے خادم تھے۔ لیکن جیسے وہ اور ہر قسم کے تعصب سے پاک تھے ویسے ہی لسانی تعصب سے بھی کوسوں دور تھے۔ "خمخانۂ جاوید" کے تبصرے میں لکھا ہے:

"آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی سے جو اختلافات ہندو مسلمانوں میں اردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہیں اُن کی رفع دفع اگر ہوسکتی ہے تو اس طریقے سے ہوسکتی ہے۔ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اُس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے، اس طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے ہر دلعزیز ہیرو (لالہ سری رام صاحب) نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہوسکے پرہیز کریں اور اُن کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالامال کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک متنازعہ فیہ زبان کو مقبولِ فریقین بنائیں......... مذکورۂ بالا اختلافات کے متعلق جو

تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے اس قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں اُنھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا ...... اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الحصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے، اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ جو اردو اُن کو اس قدر عزیز ہے اس کی گرامر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر پر ہے۔ عربی فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسماء اس میں کثرت سے شامل ہوگئے ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہوسکتی برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر ......"

ایسی سچی اور کھری باتیں وہی کہہ سکتا ہے جسے تعصب اور ناانصافی چھو نہ گئی ہو اور جس کے خمیر میں انصاف اور رواداری بسی ہوئی ہو۔ یہ باتیں اکثر لوگوں کو ناگوار گزریں اور اُنھوں نے اس کی مخالفت کی مگر حالیؔ نے ہمیشہ سچ کی تلخی کو برداشت کیا تھا۔ اس معاملے میں سچی بات کہنے سے کیوں دریغ کرتے؟

مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی اُنھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اردو کے ادیب اور محقق کو سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا ضرور جاننا چاہیے" اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دِلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دست گاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصّہ اسماء کا ہندی سے ماخوذ ہے .... پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے۔ وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو

عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے ......"

حالیؔ کا خیال تھا کہ ہندی کے آسان اور شیریں الفاظ زیادہ سے زیادہ اردو میں داخل کرنے چاہئیں اس سے زبان میں وسعت لوچ اور شیرینی پیدا ہوگی۔ انھوں نے خود اپنی نثر اور نظم میں بڑی خوبی کے ساتھ سینکڑوں ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کیے ہیں۔ اگر حالیؔ کے مشورے پر عمل کیا جاتا اور ان کی تقلید اردو زبان کے حامی کرتے تو شاید ہندی اردو کا جھگڑا اتنا نہ بڑھنے پاتا۔ اگر مسلمان ہندی سے وہ بے اعتنائی (جو حالیؔ کے زمانے میں کم اور بعد میں بہت زیادہ برتی گئی) نہ برتتے تو آج اردو کو ہندوستان میں یہ روزِ بد نہ دیکھنا نصیب ہوتا۔ اردو سے جو تعصّب آج پھیلا ہوا ہے اُس میں بیچاری اردو کا کوئی قصور نہیں۔ وہ سینکڑوں برس سے سب اہلِ وطن کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ اور اب بھی کروڑوں کے دل میں اُس کی محبت موجود ہے۔ اس کی مخالفت کی ذمّے داری ایک حد تک اُس کے اُن نادان دوستوں پر ہے جنھوں نے اُس کی حمایت کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے اُسے نقصان ہی نقصان پہنچا۔ یا اُن سیاسی حالات کی بدولت اسے یہ دشمنی سہنی پڑ رہی ہے جنھوں نے ملک کو تقسیم کرا کے تہذیب، تمدّن، زبان سب کو تقسیم کرانے کی بنا ڈالی۔

سودیشی کی تحریک مولانا حالیؔ کے سامنے شروع ہو چکی تھی اور وہ اس کے بڑے حامی تھے اور اسے ملک و قوم کے لیے بہت فائدہ مند سمجھتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ والد مرحوم سودیشی کپڑا بڑے شوق سے پہنتے تھے اور پانی پت کے جُلاہوں کا بُنا ہوا کپڑا دوستوں کو تحفے کے طور پر بھیجا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اعلیٰ درجے کی گبرون کا تھان جو پانی پت کے جلاہوں نے بنا تھا انھوں نے سرسیّد کو تحفے میں بھیجا جس کا انھوں نے سوٹ سلوایا۔ اور شام کے وقت جب عمارتوں کے معائنے کے لیے آتے تو اکثر اس سوٹ کو پہنا کرتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں منشی دیانرائن نگم (اڈیٹر زمانہ) نے مسلمان مشاہیرِ ہند سے سودیشی کی تحریک کے بارے میں یہ تین سوال پوچھے تھے:

۱۔ سودیشی تحریک بذاتِ خود ملک کی ترقی کے لیے کہاں تک مفید ہے۔ اس کے نشیب و فراز

نفع نقصان اور عمل درآمد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۲ ۔ سودیشی تحریک میں ہندو مسلمانوں کے اتّفاق کی کہاں تک ضرورت ہے۔ خاص مسلمانوں کے لیے اس سے کہاں تک نفع یا نقصان پہنچنے کی امّید ہے؟

۳ ۔ اس کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کی کامیابی کا ہندو مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بحیثیتِ مجموعی کیا اثر ہوگا؟

مولانا حالؔی نے ان سوالات کا جواب مفصّل مضمون کی شکل میں بھیجا تھا جو "زمانہ" کے اپریل ۱۹۰۶ء کے پرچے میں شائع ہوا تھا۔ اُن کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ جس قدر تحریکیں اب تک ہندوستان کی بھلائی کے لیے دیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں میرے نزدیک اُن میں سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کی اُمید ہو سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی۔ دوسرے سوال کے جواب میں لکھا کہ ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی نہ صرف سودیشی تحریک میں بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی عام بھلائی سے تعلّق رکھتا ہو اشد ضرورت ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں کے حق میں مفید ہے ویسی ہی مسلمانوں کے حق میں مفید ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا رہے گا۔ لوگوں کو اس سُرنگ کا راستہ معلوم ہوگیا ہے جس راستے سے ملک کی دولت غیر ملکوں کو کھنچی چلی جاتی ہے۔ مگر اس راستے کو بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائے تو سمجھو اس کو بہت جلد کامیابی ہوگئی۔

مسدّس میں کئی جگہ ان خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں   تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں   تو مشرق سے مغرب کو لینے کو جائیں

ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ
مکینکس کی رَو میں تاراج ہیں وہ

نہ پاس اُن کے چادر، نہ بستر ہے گھر کا   نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو، نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا   صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا

کنول مجلسوں میں، قلم دفتروں میں
اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں

جو مغرب سے آئے نہ مالِ تجارت   تو مرجائیں بھوکے وہاں اہلِ حرفت
ہو تجّار پر بند راہِ معیشت   دکانوں میں ڈھونڈے نہ پائے بضاعت

پرائے سہارے ہیں بیوپار والے سب
طفیلی ہیں سیٹھ اور تجّار وال سب

حالؔی کہنے کو ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے تھے لیکن یہ زمینداری یو۔پی اور بہار کے رئیسوں کی زمینداری نہ تھی بلکہ پنجاب کے بٹوارے کے اصولوں پر زمین والے اپنی زمین بٹائی پر (آدھا آدھا حصّہ) کسان کو دیا کرتے تھے اور نفع نقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوتے تھے اور اس چھوٹے سے زمیندار خاندان کے افراد کو اپنے کنُبے کا پیٹ پالنے کے لیے ہمیشہ محنت مشقّت کرنی پڑتی تھی۔ حالؔی نے آنکھ کھول کر دیکھا تو عزت کو ساتھی اور صرف محنت اور کوشش کو مددگار پایا اور وہ اپنے خاندان کے دوسرے بوڑھوں اور جوانوں کی طرح زندگی بھر محنت اور کام کرتے رہے۔ لیکن اُن سے زیادہ خوش دلی اور لگن سے وہ محنت کو عزّت اور کام کو انسان کی عظمت کا سبب سمجھتے تھے۔ وہ خود "مزدور" تھے اور محنت کرنے والوں کی اور ان کے کام کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس کی تعریف خود حالؔی کی زبانی سنیے۔ نکمّوں اور مفت خوروں کے ذکر کے بعد کہتے ہیں ؎

مگر اک فریق اور اُن کے سوا ہے   شرف جس سے نوعِ بشر کو ملا ہے
سب اس بزم میں جن کا نور و ضیا ہے   سب اس باغ کی جن سے نشو و نما ہے

ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر

نہ راحت طلب ہیں نہ مہلت طلب وہ   لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وہ   بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ

وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

چُنیں گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ وایواں — بُنیں گر نہ وہ شاہ وکشور ہو عریاں
جو بوئیں نہ وہ، تو ہوں جاں دادۂ جاں — جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں

یہ چلتی ہے گاڑی انھیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بیکل ہوں سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تابِ تواں کو — گھلاتے ہیں محنت میں جسم اور جاں کو
سمجھتے نہیں اس میں جاں اپنی جاں کو — وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو

بس اس طرح جینا عبادت ہے اُن کی
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے اُن کی

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انھیں سے — زمانے کا ہے گرم بازار انھیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انھیں سے — کھلے ہیں خدائی کے اسرار انھیں سے

انھیں پر ہے کچھ فخر گر ہے کسی کو
انھیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے اُن سے — ہر اک قوم کی شان وشوکت ہے اُن سے
نجابت ہے اُن سے، شرافت ہے اُن سے — شرف اُن سے، فخر اُن سے، عزّت ہے اُن سے

جفاکش بنو گر ہو عزّت کے خواہاں
کہ عزّت کا ہے بھید ذِلّت میں پنہاں

حالیؔ نے جس طرح کام اور محنت کی اور محنتی اور مزدور کی تعریف کی ہے، اور جس عزّت اور اہمیت کا مقام اسے بخشا ہے وہ بڑی بڑی تعریفوں اور لمبے چوڑے مضامین اور کتابوں پر بھاری ہے۔ حالیؔ کسی کے دشمن نہ تھے۔ نہ سرمایہ دار کے نہ زمیندار کے۔ نفرت اور دشمنی اُن کی فطرت کے خمیر ہی میں نہ تھی۔ لیکن وہ کاہلوں، نکموں اور مفت خوروں کو انسانیت کے دامن پر ایک داغ سمجھتے تھے۔ اُن کے

نزدیک صرف وہی انسان عزّت وشرف کا مستحق اور حکومت وجہاں بانی کا اہل ہے جو خود اپنی محنت پر بھروسا کرتا اور محنت کی "ذلّت" گوارا کرتا ہے۔ اس میں وہ کسی کی تخصیص نہیں کرتے۔ محنتی آدمی خواہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اُن کے لیے قابلِ احترام ہے۔ اُن کے دل میں ہر طبقے کے اشخاص کی اصلاح کا جذبہ تھا۔ نکمّے، کاہل، بے حس اور مفت خوروں کے بھی وہ دشمن نہ تھے۔ وہ اِن گمراہوں کا خون بہانے کے بجائے اُن کو سیدھے راستے پر ڈالنا اور اُن کی بے حسی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ انھیں نفسی مریض سمجھتے تھے جن کے علاج کی ضرورت ہے۔ مجرم نہیں جن کو سزا دی جائے۔ شاید اسی وجہ سے باوجود ملک وملّت کی تباہ حالت کا اس قدر غور سے مطالعہ کرنے کے انھیں انسانیت پر بھروسا، مسلمانوں کے مستقبل پر ایمان اور اہلِ وطن سے محبّت اور اُمید ہے۔

حالیؔ کے ذہن میں وطن کا مفہوم کیا تھا؟ اس موضوع پر ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک خطبہ "حالیؔ بحیثیت ایک محبِّ وطن کے" مطالعے کے قابل ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں۔ "اور حالیؔ کا وطن کیا تھا؟ پہلے تو حالیؔ کا وطن اُن کا گھر اور کنبہ اور پانی پت تھا۔ جس کے ساتھ اُن کی شیفتگی کا حال پانی پت میں کیا سناؤں؟ یہ محبّت ایسی تھی کہ دلّی کی محبّت بھی اُن سے پانی پت نہ چھڑا سکی۔ اس کے بعد حالیؔ کا وطن بڑھ کر دلّی ہوا جس کا ذکر جہاں کرتے ہیں اس طرح کہ سخت سے سخت دل پسیج جائے...... مگر سلطنتوں کی تخریب، حکومت کی تبدیلی، تمدّنوں کے تصادم نے اس وطن کے تصوّر کو وسیع کیا اور اب ہندوستان اُس کا وطن ہوگیا۔ اس کے کوہ وصحرا، آسمان وزمین اُس کی دل لگی کی شکلیں بنیں وہ اُس کے عنادل کے نغمۂ سحری اور اس کی تاروں بھری رات کو یاد کرتا اور اُس خاک کو پاک جانتا...."

یوں حالیؔ کے وطن کا نظریہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اب اُن کا ملک اُن کا وطن بن گیا تھا۔ اور اُس کی محبّت اُن کے دل میں گھر کر چکی تھی ؎

تیری اک مُشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

لیکن وہ محض وطن کی خاک کی محبّت اور در و دیوار کی الفت پر قانع نہ ہوسکے۔ جسے خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہو وہ کیسے اس پر بس کر سکتا تھا؟ چنانچہ انھوں نے خود ہی اپنے کو ہوشیار کیا ؎

اے دل! اے بندۂ وطن ہشیار　　خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار
نام ہے کیا اسی کا حُبِّ وطن؟　　جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کیا وطن کی یہی محبّت ہے؟　　یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے؟
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند　　اس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ فرقت میں　　سُوکھ جاتے ہیں رُوکھ فرقت میں

اب وطن کی محبّت کے صحیح مفہوم کو حالؔی پا گئے! وطن کی محبت صرف اینٹ پتھر اور مٹی کی محبت نہیں .... ایسا ہو تو انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا رہا۔ وطن کی محبت عبارت ہے اہلِ وطن کی محبت سے! جس کا مطلب ہے ان کی اصلاح اور بہبود کی کوشش۔ ان کو اخلاقی پستی سے اُبھارنا۔ ان کو دنیا میں عزّت سے رہنے کے گُر سکھانا اور ان کی معاشرتی حالت کو بہتر بنانا۔ وہ ایسے سچّے محبِّ وطن کی تلاش میں ہیں ؎

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد　　نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح　　جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے　　قوم کا حالِ بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

پھر اہلِ وطن کو مخاطب کرتے ہیں ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو　　اٹھو، اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ پیو، چلے جاؤ
جب کبھی زندگی کا لطف اٹھاؤ　　دل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار　　زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
مقبلو، مدبروں کو یاد کرو　　خوش دلو! غم زدوں کو شاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ　　تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

حبِّ وطن کے اسی مفہوم کو ایک اور جگہ بیان کرتے ہیں ؎

اُن کی کیا عزّت ہے یارو قوم ہے جن کی ذلیل　　ان کی کیا راحت ہے جن کی قوم ہے خستہ حال
ہے وہ ایسا غول میں قلبوں کے جیسے ایک میٹ　　ہے ہزاروں مفلسوں میں ایک اگر آسودہ حال
شال گُدڑی سے ہے واں سو مرتبہ بدتر جہاں　　ہوں ہزاروں گُدڑیاں اور ایک کے کاندھے پہ شال

قوم کا لفظ حالؔی کے زمانے میں اس معیّن معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا جس میں آج ہونے لگا ہے۔ کبھی وہ پیشہ وروں کی تخصیص کرتا تھا، کبھی کسی فرقے کے لیے بولا جاتا تھا اور کبھی پورے اہلِ ملک کے لیے۔ حالؔی نے اسے کہیں کہیں فرقے کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے لیکن جب سب اہلِ وطن کو خطاب کرنا ہوتا ہے اس وقت وہ قوم کا لفظ اُس وسیع معنی میں بولتے ہیں جس میں آج بولا جاتا ہے۔ ایک سچّے محبِّ وطن کے قلبی تاثرات دیکھیے اور سر دُھنیے ؎

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا گر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی　　اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ　　لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے جب بھائیوں سے جب بھائی　　جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

اور آج کل میں متعصّب مسلمان اور متعصّب ہندو حالؔی کی وطن کی سچّی محبّت اور حق گوئی پر غور کریں ؎

پاؤں اقبال کے اُکھڑنے لگے　　ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا　　کبھی دُرّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتلِ عام کیا　　کبھی محمود نے غلام کیا

اور آخر میں ؎

سب سے آخر کو لے گئی بازی ایک شائستہ قوم مغرب کی

حالی پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ سچے محبِ وطن نہ تھے بلکہ انگریز کے بہی خواہ، مدح خواں اور ساتھی تھے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کی تعریف کی ہے۔ ملکہ وکٹوریا اور بعض دوسرے حاکموں کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ مسلمانوں کو انگریز حکومت کا ساتھ دینے اور مغربی تعلیم کا حامل بنانے کی تبلیغ اور کوشش کی ہے (یادگارِ حالی کے ایک محترم تبصرہ نگار نے اس پر یہ اعتراض فرمایا تھا کہ مصنّف نے حالی جیسے انگریز پرست کو زبردستی قوم پرست بنانے کی ناکام کوشش کی ہے) ان اعتراضوں کا کچھ حصہ صحیح ہے اور کچھ غلط جس کی وجہ معترضین کی تنگ نظری اور حالات کو اُن کی صحیح روشنی میں نہ دیکھ سکنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے ابتدا میں انگریزی یعنی ملکہ وکٹوریا کی حکومت کو ہندوستانیوں کے لیے خصوصاً مسلمانوں کے لیے رحمتِ الٰہی سمجھا تھا۔ انھوں نے انگریز حاکموں کی تعریف بھی کی اور مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی۔ مغربی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ اور اہلِ وطن کی ترقی و فلاح کا واحد ذریعہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ مغربی علوم حاصل کریں۔ لیکن کیا اس سے حالی کے محبِ وطن ہونے پر کوئی حرف آتا ہے؟ یا وہ انگریز پرست اور ابن الوقت ثابت ہوتے ہیں؟ یہ کہنا تعصب اور تنگ نظری کی دلیل اور حالی کی زندگی، سیرت اور خیالات سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا۔ ہم حال اور ماضی کے فرق کو اور حالات کے تضاد کو پیشِ نظر رکھ کر ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حالی محبِ وطن، قوم پرور اور وطن پرست تھے یا انگریز پرست۔ اس کے لیے ہمیں مختصر طور پر اُس زمانے کے حالات پر سرسری سی نظر ڈالنی ضروری ہے۔

حالی نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو ایک ایسے دیس میں پایا جہاں بدامنی، انتشار، ابتری اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ غربت، جہالت، قحط، وبائیں عام تھیں۔ ملک میں کوئی باا‌ثر اور مستقل حکومت نہ تھی بلکہ وہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں اور ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جہاں کے فرماں روا ایک دوسرے پر حملے کرنے، اور اپنی طاقت اور اثر بڑھانے میں محو تھے۔ نہ اُنھیں رعایا کی فکر تھی نہ ملک کی حالت سنبھالنے کا خیال۔ اِلّا ماشاء اللہ زیادہ تر یہی فضا

تھی۔ لوگوں کو سکون اور اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوتا تھا۔ امن پسند، صلح کل لوگ خاموشی سے اپنے اپنے کونوں میں بیٹھے رہتے تھے۔ علم اور ادب اور مذہب کے خادم اُسی گوشۂ تنہائی میں اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ لیکن میدان میں آنے اور کسی بڑی تحریک کو چلانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اُدھر ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا تسلّط بیٹھا رہی تھی۔ اور ایک کے بعد ایک ریاست ہڑپ کرتی جاتی تھی۔ ایک طرف عوام میں آہستہ آہستہ بغاوت کے جذبات پرورش پا رہے تھے اور دوسری طرف تخریبی عناصر اس بدنظمی سے فائدہ اُٹھا کر ملک میں زیادہ سے زیادہ لوٹ مار، ٹھگی اور تباہی پھیلا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ پہلے شورش پسند عناصر نے ملک کی آزادی کے نام پر ظلم و بربریت کے مظاہرے کیے اور پھر کمپنی کی حکومت نے بدلے میں ظلم و استبداد کی انتہا کر دی اور چن چن کر ہر اس شخص کو مار ڈالا یا تباہ کیا جس سے ذرا بھی مخالفت یا مقابلے کا اندیشہ تھا۔ اس بغاوت میں بھی مسلمان پیش پیش تھے اور انتقام کا شکار بھی زیادہ تر وہی ہوئے۔ دلّی کی نام نہاد حکومت ختم کر دی گئی، بادشاہ کو قید کر کے جلاوطن کیا گیا، شاہی خاندان تباہ و برباد ہو گیا اور آخر فرماں روائے انگلستان ملکہ وکٹوریا نے ہندوستان کو براہِ راست اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور جو ابتری، غارت گری اور ظلم و ستم کا دور جاری تھا اسے ختم کر کے ملک میں پھر سے امن، نظم اور وحدت پیدا کی۔ اور صدیوں بعد ہندوستان کو بدنظمی، غارت گری اور انتشار سے نجات ملی اور اُسے سکون کا سانس لینا نصیب ہوا۔ اور یہ سوچنے کا موقع ملا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا اور اُسے کیا کرنا چاہیے؟

ہنگامی دور گزر جانے کے بعد برادرانِ وطن نے بہت جلد بدیسی حکومت کو اپنا لیا۔ اور مغربی تعلیم حاصل کرنے میں بھی وہ پیش پیش نظر آنے لگے۔ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کو ایک طرف "اپنی حکومت" کے جانے کا غم تھا تو دوسری طرف بدیسی حکومت سے مذہبی تعصب بہت بڑھا ہوا تھا۔ وہ انگریزی حکومت سے تو ٹکر نہ لے سکتے تھے البتہ غم و غصے میں مغربی علوم سے دشمنی مول لے لی تھی اور تہیہ کیے ہوئے تھے کہ اس حکومت کے رائج کردہ علوم سے روگرداں رہیں گے اور ہرگز کوئی فائدہ نہ اُٹھائیں گے۔

لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ ایسا بھی تھا جس کی دور اندیشانہ نگاہوں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی یہ

ناعاقبت اندیشی، قدامت پسندی اور تنگ نظری اُن کو تباہی کے گڑھے میں ڈھکیل دے گی اور وہ ہر لحاظ سے ذلیل اور پست ہو کر رہ جائیں گے ایک طرف حکومت دشمنی میں ان کو کچل ڈالے گی، دوسری طرف وقت کا ساتھ نہ دینے اور جدید مغربی علوم سے بیگانہ رہنے کے سبب زمانہ اُن کو خود ہی پیس ڈالے گا۔ اس لیے خیر خواہِ قوم لوگوں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ وقت کی پکار کا جواب دیں اور مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے چونکا کر ان کو زمانے کا تقاضا سمجھائیں۔ سرسیّد اس گروہ کے ہراول اور رہنما تھے۔ حالی سرسیّد کے ساتھی اور پیرو۔

حالی نے ۱۸۵۷ء کا پُر آشوب دور اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بہت کچھ جھیلا تھا۔ اس سے پہلے کے اور اس کے بعد کے حالات سے دوچار ہوئے تھے اور ان سب کا ان کے حسّاس دل پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ چنانچہ جب امن و امان ہوا تو انھیں بھی یہ حکومت جس نے ایک طرف ملک میں وحدت اور امن پیدا کیا دوسری طرف جدید مغربی علوم کو مروّج کیا اور جدید ایجادات سے زندگی کو آسان بنا دیا، بڑی غنیمت معلوم ہوئی۔ نوجوان حالی نے اسے ملک اور قوم کے لیے فالِ نیک سمجھا۔ سرسیّد کی طرح اُن کا بھی یہی خیال تھا کہ اس شائستہ ترقی یافتہ قوم کی بدولت ہم بھی پستی اور جہالت کے گڑھے سے نکل کر زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ترقی کے منازل طے کر سکیں گے۔ وہ کوئن وکٹوریا کے عہد کی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ؎

وہ دورِ تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف
وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر

اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع
جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر

جب بیٹیوں نے زندگی اس طرح سے پائی
دی زندگی اک اور انھیں علم پڑھا کر

اس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت
انساں کو نہ سمجھا کسی انسان سے کمتر

دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسمِ ستی کی
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہدِ کہن پر

نابود کیا اس نے زمانے سے ٹھگی کو
اک قہر تھا اللہ کا جو نوعِ بشر پر

گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر
کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر

ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک
آزادی و انصاف حکومت کے ہیں جوہر

قیصر[1] کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

ان اشعار سے صاف ٹپکتا ہے کہ حالی کس لیے قیصرِ ہند کی حکومت کے اور خود اس کے مدّاح ہیں۔ اُس وقت غالباً ان کا یہ خیال تھا کہ جس طرح صدیوں پہلے دوسرے حملہ آور ہندوستان کو فتح کر کے یہیں کے ہو رہے تھے اور اپنا سود و زیاں اسی ملک سے وابستہ کر دیا تھا، جو اپنا تھا وہ ملک کو بخشا، جو ملک کا تھا اُس سے خود فیض اُٹھایا اور ہمیشہ کے لیے ہند میں رس بس کر ہندوستانی بن گئے؛ اسی طرح یہ نئی مغربی حاکم قوم بھی ہندوستان میں رہے گی اور ہندوستانی ہو جائے گی۔ ہندوستان اس کے علم و فراست اور تجربے سے فائدہ اُٹھائے گا اور جدید دنیا میں سربلند اور با اقتدار ہو کر رہ سکے گا۔ اسی لیے وہ اس حکومت کی تعریف کرتے ہیں اور مسلمانوں کو جو اس وقت قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب میں سرشار تھے حکومتِ وقت کا ساتھ دینے اور جدید مغربی علوم سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اِن حالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ حالی قوم پرست اور وطن دوست تھے یا انگریز پرست اور حکومت کے بہی خواہ، ان کی ہمدردی اور محبت وطن کے ساتھ تھی یا بدیسی حاکموں کے ساتھ؟ وہ کس ذاتی غرض سے بدیسی حکومت کی تعریف کرتے یا قوم کی فلاح کے خیال سے اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے؟ (یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ اس وقت قومی تحریک جو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے موسوم ہوئی اور جسے مہاتما گاندھی نے تحریکِ آزادی کا ارگن بنایا، محض برائے نام تھی اور خود بڑی انگریز دوست واقع ہوئی تھی۔ اور مسلمان تو اس سے بالکل ہی الگ تھے۔)

لیکن رفتہ رفتہ حالات اور رفتارِ زمانہ نے حالی پر یہ روشن کرنا شروع کیا کہ بدیسی حاکم ایسے نہیں جیسا وہ سمجھتے تھے۔ وہ پُرانے حاکموں سے بہتر سہی، ان کی حکومت میں امن و سلامتی کا دور دورہ سہی، مگر ان کے پیشِ نظر اپنے ملک کی فلاح اور فائدہ ہے ہندوستان کا نہیں۔ وہ فاتح نہیں تاجر ہیں

---

[1] ملکہ وکٹوریا۔

اور وہ ہندوستان میں نفاق، تعصب اور تفریق پیدا کرکے اپنی حکومت باقی رکھنا اور اپنا گھر بھرنا چاہتے ہیں تو بے اختیار وہ پکار اُٹھتے ہیں ؎

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح　　واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی　　یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر　　مانو اُسے، اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام کیے جاؤ وہ لیکن　　جو بات سبک ہو اُسے مُنہ سے نہ نکالو

رائے کی جگہ سیاست کا لفظ رکھ دیجیے، انگریزی سامراج کی ساری پالیسی اور حکومت کو چند شعروں میں کس طرح آئینہ کر دیا ہے۔

اور جب حالیؔ نے یہ دیکھا کہ مغربی قوم کی لوٹ محض مادّی چیزوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی "حکمت" اور "سیاست" کی بدولت مشرقی قوموں کی اخلاقی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے تو وہ اور بھی مایوس اور بد دل ہو گئے۔ وہ جدید مغربی تعلیم کے حامی ضرور ہیں مگر مشرقی خوبیوں اور مشرقیت کو اپنا بیش بہا قومی سرمایہ بھی سمجھتے ہیں جسے کسی قیمت پر چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ ایک جگہ مغربی قوموں کی تاجرانہ لوٹ کا ذکر کس انداز میں کرتے ہیں ؎

نہیں خالی خطر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن　　حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے، نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں　　یہ گلچینی ہے یا اُٹّس ہے گلچیں یا ہے قزّاقی

جب وہ دیکھتے ہیں کہ بدیشی ہر جگہ دیسیوں کو ذلیل کرتے ہیں، ہر موقع پر "کالے" اور "گورے" کا فرق کیا جاتا ہے تو اُن کا غیرت مند دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں اس فرق کو خوب بیان کیا ہے۔ ایک "کالا" اور ایک "گورا" دونوں بیماری کا سارٹیفکٹ لینے ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں، راستے میں دونوں میں تکرار ہو جاتی ہے "گورا" "کالے" کو مار مار کر نیم جان کر دیتا ہے اور آخر "کالا" ڈولی پر ڈال کر اور "گورا" گھوڑے پر سوار جب ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے تو ڈاکٹر نے ؎

دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیقِ مرض　　اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکّے سے مرے　　کر نہیں سکتا حکومت ہند میں وہ زینہار

اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند　　کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے　　آئے بابا اُس کی بیماری کا کیوں کر اعتبار

حالیؔ کو اپنی زندگی ہی میں اندازہ ہونے لگا تھا کہ انگریزی حکومت سے جو توقعات اُنھوں نے قائم کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آئیں تو اُن کے دل میں بار بار ایک کانٹا سا کھٹک اُٹھتا ہے ؎

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا؟　　دیکھا ہے ہم نے برسوں لُطف و کرم تمھارا

کبھی بے چین ہو کر کہہ اٹھتے ہیں ؎

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسی کا پاس تو ہو　　بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں
صحرا میں کچھ بکریوں کو قصّاب چراتا پھرتا تھا　　دیکھ کے اس کو سارے تمھارے آگئے یاد احسان ہمیں

اِس سلسلے میں ہم عبادت بریلوی کے ایک مضمون کا ایک اقتباس دیتے ہیں جس میں انھوں نے حالیؔ کے سیاسی خیالات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

"حالیؔ کی سیاست مسلمانوں کی سیاست ہے۔ وہ خود بھی سچّے اور مخلص مسلمان ہیں۔ اُنھیں مسلمان قوم کا خیال بھی سب سے زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی بھی ہیں۔ ہندوستانی ہونے کا شدید احساس ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ اور وہ قومی زندگی اور اس کی ترقّی کے لیے اس ہندوستانیت کو ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ ہندوستان کی ہر چیز سے ان کے یہاں گہری دلچسپی ملتی ہے یہاں تک کہ وہ خود اپنی نظموں کے اندازِ بیان میں بڑی حد تک ہندوستانی رنگ پیدا کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ہندوستانیوں کی غلامانہ ذہنیت کو جو صدیوں سے غلام رہنے کی وجہ سے اُن میں پیدا ہو گئی تھی، ایک جگہ حالیؔ نے طنزیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے ؎

ایک ہندی نے کہا، حاصل ہے آزادی جنھیں　　قدرداں اُن سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں　　قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو، اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا　　بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
یعرف الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم　　دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

سن کے اِک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا — ہے سقر موری کے کیڑے کے لیے باغِ ارم

لیکن ان اشعار میں وہ جوش اور زور نہیں ملتا جو ان کے دوسری قسم کے اصلاحی کلام میں نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت خود قومی تحریک بے جان سی تھی۔ دوسرے حالیؔ اس وقت تک بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ جوانی کا ولولہ اور جوش لے کر کسی نئی تحریک میں شریک ہونا دشوار تھا۔ لیکن ان کی طبیعت کی افتاد اور زندگی بھر کے کارناموں کو اور ہر ترقی پسند تحریک سے اُن کی وابستگی کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ حالیؔ اگر دس بیس برس اور زندہ رہتے اور وہ سب آنکھوں سے دیکھتے جو ملک اور قوم کو بدیسی حکومت کی بدولت سہنا پڑا تو وہ ضرور آزادی کی پرخلوص و پرجوش تحریک سے متاثر ہوتے اور کیا عجب کہ وہ اس میں اُسی اُمنگ اور ولولے کے ساتھ شریک ہوتے جیسے اصلاحی تحریکوں میں ہوئے تھے۔

یہ بات تو حالیؔ اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ ملک کی نہ صرف ترقّی و بھلائی بلکہ آزادی کا راز بھی اتفاق میں ہے۔

ایک موقعے پر ہندو مسلم محبت کے کسی منظر کو دیکھ کر مسرّت سے بے خود ہو کر کہہ اٹھتے ہیں ؎

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا — گھر اہلِ وطن کے دل میں اُلفت نے کیا

تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے — جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا

برگ و بار

اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے حالی کی ادبی اور قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "تاریخِ سیاسی میں، تاریخِ تعلیمی میں، تاریخِ معاشرت میں، تاریخِ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اُس کا سلسلہ اُس ادیب، شاعر، مصلح، محبِ وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوشِ ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس "فرشتہ خصائل انسان" کی سیرت اور عملی خدمات کا ایک ادھورا سا خاکہ آپ نے گذشتہ صفحات میں دیکھا۔ اب ہم اُن کی شاعری پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس تبصرے میں حالی کی شاعری کی ہر صنف غزل، مثنوی، مسدس وغیرہ پر الگ الگ، اختصار سے بحث کی جائے گی۔ سب سے پہلے میں حالی کی غزل کو لیتی ہوں جس سے اُن کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔

حالی کی غزل

ہمارے ہاں جو شخص ایک اچھا سا تخلص رکھ لے، کچھ تُک بندی کر سکے یا پرانے شاعروں کے کلام میں کچھ ردو بدل کر کے اُسے اپنا سکے، عام طور پر لوگ اُسے شاعر مان لیتے ہیں۔ گنتی کے

اہلِ ذوق ہیں جو شاعر اور ناشاعر میں تمیز کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا شاعر بن جانا ایسا آسان ہے؟ نہیں۔ "تخیل کی تیزی، نظر کی باریکی، حُسن اور تناسب کی پرکھ، احساس کی شدت، خصوصاً محبت اور خودی کے جذبات کی فراوانی"[1] ان اجزا کی ترکیب سے شاعر بنتا ہے۔ اگر کسی انسان میں یہ ساری کی ساری خصوصیات بیک وقت موجود نہیں تو وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے مگر شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے اِن خصوصیات کا ہونا لازمی ہے اور شاعر و متشاعر میں ہم اسی سے فرق کر سکتے ہیں۔

لیکن شاعر شاعر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اکثر شاعر محض داخلی جذبات اور احساسِ خودی کی تسکین ہی کو شعر کی معراج سمجھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا شاعر بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کی نظر میں شاعری کا مقصد اس سے زیادہ وسیع اور بلند ہوتا ہے۔ اس فرق کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو طبیعت اور سیرت کا اختلاف، دوسرے زمانے اور ماحول کا اثر۔ شاعر جیسے زمانے میں پیدا ہوتا ہے اس کا بہت گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے اپنے مضمون حالی میں اس فرق کو یوں بیان کیا ہے:

"اگر زمانہ انتشار کا ہے، معاشرت کا شیرازہ بکھر چکا ہے، فرد کا رشتہ جماعت سے ٹوٹ گیا ہے، سب اپنے اپنے حال اور اپنی اپنی فکر میں ہیں تو شاعر بھی باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر کے اندر کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔ اُس کا تخیل اور اس کا مشاہدہ نفس کے دائرے کو اپنی جولانی کے لیے تنگ پاتا ہے تو اس واردات کو جو اُس کے قلب پر گذرتی ہے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اُس میں نئی نئی باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کی قید ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ محض خیال کے جادو سے وہ ایک طلسمِ حیات باندھتا ہے اور اُس میں مگن رہتا ہے۔ اُس کی نظریں حُسن اور تناسب کو ڈھونڈتی ہیں، مگر وہ عالمِ فطرت اور عالمِ معاشرت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک خیالی پیکرِ حسن تراشتا ہے اور اس کی خفیف سی جھلک کسی انسان میں دیکھ کر اُسے اپنا معشوق بنا لیتا ہے۔ محبت کا جذبہ جس کی وسعت نامحدود

---

[1] مضامینِ عابد۔

بے ہمٹ کر اسی ایک مرکز پر قائم ہوجاتا ہے۔ اور اُس کی شدّت بہت بڑھ جاتی ہے۔۔۔۔۔
خودی کا جذبہ جو اس داخلیت کی فضا میں پھیل کر خود پرستی کی حد تک جا پہنچتا ہے محبّت یا عشق کا حریفِ مقابل بن جاتا ہے۔ عشق اور خودی کی اس کش مکش سے شاعر کی نفسی زندگی میں ایسے پیچ پڑجاتے ہیں جو کھولے نہیں کھلتے۔ وہ وارفتہ مزاج، بے چین، اور چڑ چڑا ہوجاتا ہے، وہ شدّت سے محبّت کرتا ہے اور اس سے زیادہ شدّت سے شکایت کرتا ہے۔۔۔۔۔"

انیسویں صدی میں اردو شاعری کچھ اسی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ اس دور میں ہمیں ایسے شاعروں کی بڑی کثرت نظر آتی ہے جن کی نفسی اور ذہنی کیفیت بعینہٖ وہ تھی جس کا جیتا جاگتا نقشہ مندرجہ بالا اقتباس میں کھینچا گیا ہے۔ لیکن شاعر کی ایک اور شان بھی ہے اور یہ اس زمانے میں اُجاگر ہوتی ہے جب زمانہ سازگار ہو، اجتماعی روح زندہ ہو اور افراد کا رشتہ زندگی اور کائنات دونوں سے قائم ہو اور شاعر اپنی فطری خصوصیات کو نشو و نما دے سکے تو یہی شاعر ہے جس کی شاعری پر "جزویست از پیغمبری" کی تعریف صادق آتی ہے۔ اس سچّے شاعر کے خدّ و خال بھی ڈاکٹر عابد حسین نے بڑی صناعی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

تخیّل کی تیزی، مشاہدے کی وسعت کے ساتھ مل کر اسے خدا کی دنیا اور انسان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہے۔ اس وسیع جلوہ گاہ میں اُسے حسن اور تناسب کا حقیقی جلوہ، حسنِ صورت حسنِ معنی کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کی ہم آہنگی اور معاشرت کے توازن سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بھی ربط و ضبط اور اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔ اُس کا جذبۂ محبت نوعی ہمدردی کے ساتھ مل کر اس قدر وسعت حاصل کرتا ہے کہ دوستی، صلہ، رحم، حبِّ وطن، حبِّ انساں سب پہ حاوی ہوجاتا ہے اور اگر وہ حبِّ الٰہی کا حوصلہ کرے تو اُسے زیب دیتا ہے۔ شاعر کی خودی کو یہ عالم گیر محبّت کاٹ چھانٹ کر سنوارتی ہے۔ انانیت کے کانٹے نکل جاتے ہیں۔ خودداری، غیرت، اعتمادِ نفس کے پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ زندگی

---

[1] مضامینِ عابد۔

اور خیالات کی حقیقت اور ہم آہنگی اسلوبِ بیان سے سادگی اور سچائی بن کر ٹپکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ شاعر متین، خوش مزاج، منکسر اور بُردبار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ درد و سوز اسی کا حصہ ہے۔ اس لیے کہ اُسے صرف اپنا ہی غم نہیں سارے جہان کا غم ہوتا ہے۔ عاشقی کا دعویٰ اس کو پھبتا ہے اس لیے کہ وہ اپنی خودی کا عکس معشوق کی ذات میں نہیں ڈھونڈتا بلکہ معشوق کی حقیقی صفات کو دیکھ کر بے ساختہ اُس کی طرف کھنچتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں اُسے بھی چکھنی پڑتی ہیں۔ محبت کی کڑیاں اُسے بھی جھیلنی پڑتی ہیں مگر وہ ضبط و متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ فریاد بھی کرتا ہے تو سادگی اور سچائی سے۔۔۔۔"

شاعر کے اس تصوّر کو ذہن میں رکھ کر ہمیں حالیؔ کی شاعری کا جائزہ لینا ہے، انھیں زمانہ سازگار نہیں ملا تھا مگر اپنی فطری اُپج اور خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر انھوں نے وہ سید ھا راستہ اختیار کیا جو شاعر کو معراجِ کمال پر پہنچاتا ہے۔

حالیؔ قدرت کی طرف سے شاعری کا مادّہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حسن و تناسب کی پرکھ، شدّتِ احساس، دردِ دل کی نعمت، تخیّل کی تیزی اور مشاہدے کی گہرائی وہ خصوصیات تھیں جو فطرت نے فیاضی کے ساتھ حالیؔ کو ودیعت کی تھیں۔ بچپن ہی سے رنج و مصائب سے دوچار ہونے کے سبب دل میں سوز و گداز پیدا ہوگیا تھا۔ جن اُستادوں نے ابتدائی عمر سے پڑھایا اُن میں سے کئی بزرگ شاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھنے والے تھے۔ اور عربی و فارسی شاعری پر انھیں عبور حاصل تھا۔ حالیؔ کے ذوقِ سخن کو سنوارنے میں ایک حد تک اُن کا حصّہ بھی ہے۔

جب اٹھارہ انیس سال کی عمر میں حالیؔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے دلّی آگئے تو وہاں بھی انھیں ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا نظر آیا۔ غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جیسے باکمال شاعروں کا دور تھا۔ حالیؔ کو اکثر مشاعروں میں اُن کا کلام سننے کا اتفاق ہوتا اور دل میں ذوقِ سخن گوئی کا احساس اُبھرتا۔ مگر شاعری کی چنگاری ابھی دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی تھی۔ وہ تحصیلِ علم کے شوق میں سخن گوئی کے فطری جذبے کو غیر محسوس طور پر کچلتے رہے۔ لیکن شاعری کو پرکھنے اور شعر کو سمجھنے کا شوق اور تیز ہوگیا۔ غالبؔ کا کلام جسے بڑے بڑے سخن گو اور سخن فہم حضرات سمجھنے سے قاصر رہتے تھے حالیؔ نے خود غالبؔ سے سمجھنا شروع کردیا۔ شعر و شاعری کی یہ دلکش فضا جو ساری دلّی پر چھائی ہوئی تھی اور غالبؔ کی ذوق

آفریں صحبت شاید ناشاعر کو بھی شاعر بنا دیتی۔ حالیؔ کتنا ہی دباتے بھلا شعر گوئی کا فطری جوہر اپنا کام کیے بغیر رہ سکتا تھا؟

دِلی اُمنگ سے مجبور ہو کر اسی زمانے میں حالیؔ نے چند غزلیں کہہ کر غالبؔ کو دکھائیں۔ غالبؔ جیسا جوہر شناس ایک نظر میں پرکھ گیا کہ یہ نوجوان قدرت کی طرف سے شعر کا سچّا ذوق اور حقیقی شاعری کی ساری خصوصیات لے کر آیا ہے۔ یہ غالبؔ کی نظر کا کمال ہے کہ انھوں نے ایک ایسے شاعر کو ابتدا ہی سے پرکھ لیا جس کی شعر گوئی کا انداز اور شاعری کا نظریہ اُن سے بالکل مختلف ہونے والا تھا۔ انھوں نے حالیؔ سے یہ کہہ کر "تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے" وہ انجم پھونک دیا جس سے حالیؔ کی شاعری کے سوتے کھل گئے۔

حالیؔ کے بچپن اور نوجوانی کا زمانہ ہندوستان کی پستی اور تنزل کا انتہائی دور تھا۔ اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ تمدنی اور معاشرتی پستی حد کو پہنچ گئی تھی۔ مغلیہ سلطنت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ لوگ اجتماعی زندگی کی اہمیت اور عزت سے بے خبر اور بیگانہ اپنی اپنی انفرادی زندگی میں مگن تھے۔ انھوں نے باہر کی دنیا کے انتشار، ابتری اور تباہی سے ڈر کر عقل اور دماغ کی کھڑکیاں بند کر لی تھیں اور دل کی تسلّی کے لیے ایک من کی دنیا الگ بنالی تھی۔ امیر حال مست تھے اور فقیر چال مست۔ عالم اپنی علمی دنیا میں محصور اور صوفی اپنے وارداتِ قلب میں مقیّد۔ شاعر اپنی خود پسندی اور عشق پرستی میں گرفتار ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کسی کو یہ فکر نہ تھی کہ کشتی ڈوبی تو سب کو ساتھ لے کر ڈوبے گی۔ نہ علم کا شیدائی عالم نہ بے گانہ تلک الدنیا زاہد۔ نہ عیش پرست رئیس نہ تخیّل پرست شاعر......

ادب اور شاعری میں انفرادیت اور داخلیت کا رنگ اور بھی زیادہ گہرا تھا۔ ادیب اور شاعر زندگی کی ترجمانی کا فرض ادا کرنے کے بجائے اپنی اپنی خیالی دنیائیں بنا کر اُن میں قلعہ بند تھے اور زندگی کے تقاضوں اور شاعر کے اصلی کام سے منہ موڑے بے وقت کی راگنی گا رہے تھے۔

حالیؔ بھی اسی دورِ تنزّل میں پیدا ہوئے تھے جس میں عشق و عاشقی کے اصلی یا فرضی ترانے گانے کا نام ہی شاعری سمجھا جاتا تھا۔ حالیؔ لاکھ پاک باز سہی مگر شعر گوئی کے لیے رندِ شاہد باز بننا ضروری تھا۔ شاعری کی محفل میں داخلے کی شرط ہی یہ تھی کہ وہی پرانا لاگ

الاپا جائے۔" ایک مدت[1] تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب یہ سودا اُچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارعِ عام پر چل لیے جس پر راہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلے کا ساتھ، راہ کی ہمواری اور رہ گذر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا خیال بھی نہ آیا......"

راہ کی ہمواری، زمانے کا اثر اور بھر جوانی کا جوش اور ولولہ۔ حالیؔ جن کی فطرت "انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی" اس داخلی اور انفرادی شاعری کے چکر میں پڑ گئے جو عشق و عاشقی اور اظہارِ خودی تک محدود تھی۔ حالیؔ نے بھی اپنے اور ہم عصروں کی طرح اپنا میدانِ سخن غزل ہی کو قرار دیا، اور اس میں اپنے جوہر دکھانے لگے۔ لیکن فطری صلاحیّت، میرؔ اور سعدیؔ جیسے شاعروں کے روحانی فیض اور غالبؔ و شیفتہؔ جیسے صاحبِ ذوق شعرا کی صحبت اور تربیت کی بدولت حالیؔ اس میدان میں بھی بڑی حد تک سنبھلے رہے۔ چنانچہ ان کے اس دور کے کلام میں بھی نہ تو وہ عامیانہ اور گھٹیا مذاق نظر آتا ہے جس کی بنیاد سطحی عشق اور ہوا و ہوس کے جذبات پر رکھی جاتی ہے اور نہ معاملہ بندی اور کنگھی چوٹی کا وہ ذکر ہے جو اُس وقت بیشتر شاعروں کا موضوع تھا۔ وہ تخیّل کی ان غیر قدرتی رفعتوں پر بھی نہیں اُڑتے جن سے شعر ایک گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔ نہ دور از کار تشبیہوں، مبہم استعاروں کا وہ جال بُنتے ہیں جس میں اُلجھ کر شعر کا مطلب خبط ہو جائے۔ انھوں نے اپنے روحانی استادوں اور زندہ استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ کیا تھا۔ میرؔ سے دردِ دل لیا، اور دردؔ سے تصوّف کی چاشنی۔ غالبؔ سے حُسنِ تخیّل، ندرتِ فکر، اور شوخیِ گفتار سیکھی اور سعدیؔ سے بیان کی سادگی اور معنی کی گہرائی۔ اور شیفتہؔ سے "سیدھی سچّی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانے" کا فن اور ان سب کی ترکیب سے حالیؔ کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا۔ اگرچہ یہ خصوصیات غزل سے زیادہ اُن کے مسدّس اور مثنوی میں جا کر چمکیں مگر غزل میں بھی اُن کی انفرادیت اُجاگر گئیں۔ اُن کی غزل میں سادگی، اصلیت اور حقیقت کا

---

[1] دیباچہ دیوانِ حالیؔ

عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ جذبات اور احساسات کو اس ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں دل کی سچی لگن اور دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کا ثبوت ملے گا ۔

ہم روزِ وداع اُن سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت — رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا؟
جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح — کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا — سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
اے دل رضائے دوست ہے شرطِ رضائے غیر — زنہار بارِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا
مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ — ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

اغماض چلتے وقت مروّت سے دور تھا — رو رو کے ہم کو اور رُلانا ضرور تھا
تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں — ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا
دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز — چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا
روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا — کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا
حالؔی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں — تھا حوصلہ اُسی کا کہ اتنا صبور تھا

قلق اور دل کا سوا ہو گیا — دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا ہمیں زخمِ دل — اگر تیر اُن کا خطا ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا — وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد — ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا — وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

نہ دے میری اُمید مجھ کو جواب — رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالؔی سے حال: — کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

اک خو سی ہو گئی ہے تحمّل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوے قتل، — کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا
گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال، — سُن لیں گے وہ مآلِ شبِ انتظار کا
اب محوِ بوئے گل پہ ہوا اب دلِ حزیں، — ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا — کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں — گل و بلبل کی شناسائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

ہوں گے حالؔی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا.

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا — چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اَب
آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ جان کا اُس میں زیاں ہے اَب
لغزش نہ ہو، بلا ہے حسینوں کا التفات — اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اَب
ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز — ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب
حالؔی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش — وہ علمِ دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اَب؟
پیغامِ دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز — جھونکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز

یاں دے چکی جواب امیدِ جوابِ خط — واں نامہ برنے بار بھی پایا نہیں ہنوز

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
یارب اس التفات کا انجام ہو بخیر — تھا اس کو ہم سے اُنس مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر — اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
مجھ کو تم سے یہ اعتمادِ وفا — تم کو مجھ سے یہ التفات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجیے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں
رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ — زندگی موت ہے حیات نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا — گھُلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے — محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُس کی — وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار — تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے
دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد ؟ — نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تونے
دور ہو اے دلِ مال اندیش — کھو دیا عمر کا مزا تونے
ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ — کیا کیا چشمِ آشنا تونے

حالیؔ کے کلام میں جا بجا تصوّف کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔ جدید اور قدیم دونوں زمانے کی غزلوں میں یہ رنگ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اُن کی راہ رسمی تصوّف سے الگ ہے۔ وہ اپنے کو پہنچا ہوا صوفی اور عارفِ کامل سمجھ کر حقیقت کے رموز و اسرار بیان کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اپنی نارسائی اور عجز کے اظہار ہی کو معراجِ محبت سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اکثر بڑے پتے کی اور دل میں چبھنے والی باتیں کہہ جاتے ہیں ؎

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا — تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس سے نادان ہی بن کر ملیے — کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے — جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

شہسواروں پہ بند ہے جو راہ
وقف ہے یاں شکستہ پاؤں پر

عشق کے بھی خوب دیکھے سازوسوز
دِل پہ کھُلتا ہے نیا اک راز روز

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

کچھ رازِ حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے
عشق اُدھر عقل اِدھر دُھن میں چلے ہیں تیری
راستہ دیکھیے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتہ
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلبگار نہیں

غم و رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دُکھاتے ہیں وہی جس میں کہ گھر کرتے ہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

زباں تقریر سے قاصر، قلم تحریر سے عاجز
نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

کل خرابات میں اک گوشے سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

مِلّتیں، رستوں کا ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر، ایک گھاٹ

درِ فیضِ حق بند تھا جب، نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک واعظ
بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
یہ طبلِ تہی ہیں، جو بجکارتے ہیں
جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

وصل کا اُس سے دلِ زار تمنائی ہے
نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار
اُس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجیے

قدرِ نعمت ہے بقدرِ انتظار
حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

یارانِ تیزگام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

ہے تجلّی بھی نقابِ روئے یار
اُس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے

ابتدائے وفا ہے سر دینا
میری دیکھی نہ انتہا تو نے

کرکے بیمار دی دوا تو نے — جان سے پہلے دل لیا تو نے

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے

دل کو دردِ آشنا کیا تو نے — دردِ دل کو دوا کیا تو نے

طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا — خاک کو کیمیا کیا تو نے

تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں — غم کو راحت فزا کیا تو نے

تھی محبت میں ننگ منتِ غیر — جذبِ دل کو رسا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ — عشق کو رہنما کیا تو نے

جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد — درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہ رو کو ذوقِ طلب — سعی کو نارسا کیا تو نے

پردۂ چشم تھے حجاب بہت — حسن کو خود نما کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھے احباب — ہم کو جادو نوا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب — کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالیؔ اُٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

حالیؔ کے دوسرے دور کے کلام میں غزل کی ایک اور صورت ملتی ہے جس سے اُنھوں نے اخلاقی اصلاح کا کام لینا شروع کیا تھا۔ اُن میں سے بعض جدید غزلیں وہ دلکشی اور حُسن نہیں رکھتیں جو حسن وعشق کی اِن داستانوں میں نظر آتی ہے۔ غالباً اسی قسم کی کچھ غزلیں دیکھ کر بعض لوگ حالیؔ کی غزل کو پھیکی اور بے مزہ بتاتے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے شاید حالیؔ کے سارے کلام کا بغور مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ ایسا فتوےٰ نہ لگاتے۔ اس میں شک نہیں کہ جب حالیؔ نے اپنی غزل کو بھی اخلاقی اصلاح کے لیے وقف کر دیا اور اُس میں عاشقانہ اور متصوفانہ کلام کی چاشنی کم ہوگئی تو پرانے مذاق کے لوگوں کو اُس میں حسن و دلکشی

نظر نہ آئی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کہیں کہیں مصلحانہ رنگ شعریت پر غالب آگیا ہے۔ لیکن اوّل تو کسی شاعر کے کلام پر حکم لگانے سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے تمام کلام کو ایک ہی معیار پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ غالبؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے یادگارِ غالبؔ میں حالیؔ نے خود لکھا ہے "یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاعر اور اُس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میرؔ کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں اسے تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اسی لیے حالیؔ کے دوسرے دور کی غزل کو جب انھوں نے ارادتاً اسے اصلاحی مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا غزل کے پرانے معیار پر جانچنا غلط ہے۔ البتہ اگر حالیؔ کی بتائی ہوئی تنقید کی اس صحیح کسوٹی پر ان کی منتخب غزلوں کو کسا جائے اور ان میں سے ان کے بہترین اشعار کو چنا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالیؔ کی غزل بھی اپنے رنگ میں اُتنی ہی پُر اثر، پر درد اور دلکش ہے جتنی کسی اور بڑے غزل گو شاعر کی۔ بقولِ آل احمد سرورؔ "وہ غزل کے خلاف ہیں۔ لیکن اُن کی بہت سی غزلیں اُردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ ان غزلوں میں، ہجر و وصل بھی ہے اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی مگر صرف یہی نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دورِ جدید کی غزلوں میں سے کچھ کا انتخاب دیکھیے:—

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر سے سر اُٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا

راجوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے — گردن کشوں کو تو نے نیچا دکھا کے چھوڑا

فرہادِ کوہکن کی لی تو نے جانِ شیریں — اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ، دونوں ہیں دل گداز تیرے — پتھر کے دل تھے جن کے اُن کو رُلا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں رُوداد تیری دل کش — شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

الفت میں دمبدم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی — چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمھارا
ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیے سوار و — ہے لاکھ لاکھ من کا اک اک قدم تمھارا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل — جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا
لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت — فرمایا، خبردار! کہ نازک ہے زمانہ

کہیں الہام منوانا پڑے گا — کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا
نصیحت بے اثر ہے گر رہو درو — یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا
رہے وصفِ جناں کی مشق واعظ — تمھیں بچوں کو پھسلانا پڑے گا
سخن میں پیروی کی گر سلف کی — انھیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا — مینھ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا
دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام — آج اگر آیا نہیں کل آئے گا
ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد — اک یہ ٹپکا دیکھیے کب جائے گا
دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف — رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا
باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل — جی قفس میں اس کا کیا گھبرائے گا
ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ — دیکھیے برسے گا یا برسائے گا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا — اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا
کر دیا اس نے تو اللہ سے غافل ناصح — اس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا
چھپ چھپاتے اسے دے آئے دل اک بات پہ ہم — مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا
دل کو یہ تونے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے — چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا
نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو — تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق — کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

راحت کا جہاں میں یونہی اک نام ہے گویا — راحت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا
کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں — بدنام ہی دنیا میں نکو نام ہے گویا
ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام — وہ کام ہیں اُن کا بھی انعام ہے گویا
ہے وقتِ رحیل اور وہی عشرت کے ساماں — آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا
اٹھا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بری طرح — آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل — ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر — آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت
اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں — دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد
گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا — آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد
یادِ خدا میں جب نہ لگی دل سے اس کی یاد — آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد
حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش — دل کش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

پیاس تیری بوئے ساغر سے لذیذ — بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ
لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب — ہم کو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ

ہے یہ تجھ میں کس کی بُو باس اے صبا — بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ
قندسے شیریں تری پہلی نگاہ — دوسری قندِ مکرّر سے لذیذ

یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو — بُلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ
جنّت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق — بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم
ہلتے ہیں اُس کے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو — کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرزِ بیاں سے ہم
لذّت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ — پوچھیں گے جاکے حاؔلیِ جادو بیاں سے ہم

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آکے پھر چمن میں — اک حشر سا بپا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
بُلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے — بجلی گری فلک سے یا گُل کِھلا چمن میں
چپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہے چشمِ نرگس — قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ — مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ
وفا اغیار کی اغیار سے سُن — مری اُلفت در و دیوار سے پوچھ
ہماری آہِ بے تاثیر کا حال — کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ
دلِ مہجور سے سُن لذّتِ وصل — نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ
نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست — کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ
فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل — یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے — قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
دمِ گریہ کس کا تصوّر ہے دل میں — کہ اشک اشک دریا ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو — وہ صرفِ تمنّا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ ان دنوں ذوقِ عصیاں — درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

یاروں کو تجھ سے حاؔلی اب سرگرانیاں ہیں — نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی — اُلفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
کہتے ہیں جس کو جنّت وہ اک جھلک ہے تیری — سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی ، ہر حال میں رہیں خوش — حصّے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا — کچھ مقبروں میں باقی اُن کی نشانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی ، اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حاؔلی لذّت ہے اک نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گُل فشانیاں ہیں

بوالہوس عشق کی لذّت سے خبردار نہیں — ہیں مئے ناب کے دلاّل قدح خوار نہیں
شہر میں ان کے نہیں جنسِ وفا کی بکری — بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے ، یہ خریدار نہیں
کون سے وہ گلِ رعنا پہ نواسنج نہیں — کون سی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں
عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ — اور جو ہو کبھی کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں
بوالہوس ، کام طلب ، بندۂ نفس ، اہلِ ہوا — ایک عالم ہے اسی رنگ میں دوچار نہیں
دعویِ عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے — اُن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں
کہیے حاؔلی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں — کہہ دو واللہ کہ صادق نہیں زنہار نہیں

ابھی حاؔلی کی شاعری کی ابتدا ہی تھی ۔ اور اُنھوں نے جوانی کی ترنگ میں عشقیہ شاعری کا

زمانہ شروع ہی کیا تھا کہ ملک کو تباہی اور بربادی کے اُس ہولناک طوفان سے گزرنا پڑا جسے ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور میں ملک اور قوم کی بدحالی و پریشانی، بدامنی و انتشار اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور ساتھ ہی لوگوں پر جمود اور بے حسی یا مایوسی اور شکست خوردگی طاری تھی۔ لیکن خدا کے کچھ بندے ایسے بھی تھے جنھوں نے اس طوفانِ مصیبت کے سامنے ہمّت اور ہوش و حواس کے ہتھیار نہیں ڈال دیے بلکہ حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ حالؔی نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دل پر سہا تھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے ملک میں انگریزی حکومت کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور مغربی تہذیب اور مغربی علوم آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ جن لوگوں نے اپنے دل و دماغ کی آنکھیں کھلی رکھی تھیں اُنھیں غدر کے ہنگامے نے یہ صاف طور پر دکھا دیا تھا کہ اب ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے جس میں مغربی علوم کا رواج ہونا لازمی ہے۔ اگر لوگوں نے اس وقت زمانے کا ساتھ نہ دیا تو وہ خس و خاشاک کی طرح زمانے کی زد میں بہہ جائیں گے۔

نوجوان حالؔی شاید اُس وقت ان سب باتوں کو پوری طرح سمجھ نہ سکتے تھے۔ لیکن غیر محسوس طور پر اُن کا ذہن انقلاب کے لیے تیار ہوتا رہا اور اُن کے کلام پر رفتہ رفتہ اس کا اثر پڑنے لگا۔ اس کا جو اثر سب سے زیادہ اور نمایاں طور پر اُن کی اس وقت کی غزل پر نظر آتا ہے وہ درد و غم کا ہے۔ وہ اب عشقیہ بیان سے اُکتانے لگے تھے۔ دِلّی پیاری دِلّی کی تباہی و بربادی اور اہلِ کمال کا قحط اور علم و اخلاق کا زوال دیکھ کر عشقیہ راگ گانے والا شاعر دل پکڑ کر چلّا اُٹھا ؎

چپّے چپّے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق — آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بُلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دِلّی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

اس زمانے میں حالؔی نے جو کچھ کہا اُس میں غالؔب کا مرثیہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اُسے پڑھ کر صاف نظر آتا ہے کہ اب شاعر رسمی بندشیں اور مروّجہ شاعری کی قیدیں توڑنے لگا ہے۔ اور اس کا ذہن چپکے چپکے کسی انقلاب کے لیے تیار ہو رہا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گو اُسے ابھی اس کا واضح احساس نہیں ہوا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "جب آفتابِ عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا وہ تمام سیمیائی جلوے جو خوابِ غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل اور تشبیب کی اُمنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔ جو لوگ عاشقانہ غزل گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا پھر زرا مشکل سے چھٹتا ہے مگر زمانے کی ضرورتوں نے سبق پڑھایا کہ دل فریب مگر نکمّی باتوں پر آفرین سُننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔ اور حاکمِ وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رُو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔"

بُلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

دل کی رام کہانی چھوڑ دی لیکن قوم کا جو روگ لگ چکا تھا اب اس کی حالت پر آنسو بہانے میں مزا آنے لگا۔

اس زمانے میں حالؔی کو چار سال تک لاہور میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کی اصلاح کا کام کرنا پڑا جس کی بدولت انھیں بہت سی مغربی تصانیف کو پڑھنے کا موقع ملا ان کو اس میں ایک نئی دنیا نظر آئی اور اُن کے مذاقِ شعر و ادب پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ حالؔی نے دیکھا کہ شعر و ادب کا میدان کتنا وسیع ہے۔ اور اس کا کام محض وارداتِ قلب کا بیان اور داستانِ عشق کا سنانا ہی نہیں بلکہ زندگی کی ترجمانی، کائنات کا مطالعہ، انسانوں کے اخلاقی اور معاشرتی معیاروں کا بلند کرنا بھی ہے۔ اور لوگوں کے دلوں میں قوم کی محبت اور خدمت کے جذبات

کو اُبھارنا بھی ! حالیؔ مغربی ادب کا یہ اثر قبول کرتے رہے اور مذاقِ شعر نئے سانچے میں ڈھلتا رہا۔ اس زمانے میں مولوی محمد حسین آزادؔ نے لاہور میں ایک نئی قسم کے مشاعرے کی بنا ڈالی، حالیؔ تو جیسے کسی ایسی تحریک کے منتظر ہی تھے، انھوں نے ان مشاعروں کے لیے چار نظمیں "برکھارُت" "نشاطِ امید" "مناظرۂ رحم و انصاف" اور "حبِّ وطن" لکھیں۔

"برکھارت" کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالیؔ کا مشاہدہ کتنا گہرا اور نظر کتنی باریک تھی اور مظاہرِ قدرت اور مناظرِ فطرت کو انھوں نے کس قدر غور سے دیکھا ہے ؎

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا　　اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے　　اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
گنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں　　جنّت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی　　قدرت ہے نظر خدا کی آتی
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحّت　　کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی　　عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار　　دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل　　ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو　　اور مور جھنکارتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی　　گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر　　کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں　　تیراکوں کے دم بڑھے ہوئے ہیں
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی　　مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں　　موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملّاحوں کے اڑ رہے ہیں اوساں　　بیڑے کا خدا ہی ہے نگہباں

ہیں شکر گزار تیرے برسات　　انساں سے لے کے تا جمادات
دنیا میں بہت تھی چاہ تیری　　سب دیکھ رہے تھے راہ تیری
تجھ سے ہی کھلا یہ رازِ قدرت　　راحت ملتی ہے بعدِ کلفت
گلشن کو دیا جمال تو نے　　کھیتی کو کیا نہال تو نے
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ　　اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

"حبِّ وطن" نہ صرف ان کی نظموں میں بلکہ اس موضوع پر آج تک جتنی نظمیں اردو میں لکھی گئیں غالباً ان سب میں بہترین ہے۔ روانی، دلکشی، حسنِ ادا اور سلاستِ بیان کے لحاظ سے بھی اور خیالات کے اعتبار سے بھی۔ اس میں شاعر نے وطن اور وطن کی محبت کے نظریے کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور بھر بڑی خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ اس کے نزدیک حبِّ وطن کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ شروع میں وطن کی جذباتی محبّت کا نقشہ کس خوب صورتی سے کھینچا ہے ؎

اے سپہرِ بریں کے سیّارو　　اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا　　اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری　　اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو　　دہرِ ناپائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز　　تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا　　تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
آن اک اک تمھاری بھاتی تھی　　جو ادا تھی وہ دل لبھاتی تھی
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار　　جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے　　نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور　　یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور

وطن کی یاد اور اس کی محبت کی مثالیں دینے کے بعد حالؔی پھر اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں ؎

نام ہے کیا اسی کا حبِّ وطن　　جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کیا وطن کی یہی محبت ہے!　　یہ بھی الفت میں کوئی اُلفت ہے
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند　　اس سے خالی نہیں چرند و پرند
کہیے حبِّ وطن اسی کو اگر　　ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کم تر

اس کے بعد حالؔی دکھاتے ہیں کہ سچی حبّ الوطنی کس کا نام ہے ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!　　اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
جب کبھی زندگی کا لطف اٹھاؤ　　دل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر　　ہے کوئی ان میں خشک کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند　　کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
مقبلو مدبروں کو یاد کرو　　خوش دلو! غمزدوں کو شاد کرو
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ　　تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ　　سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ
اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا　　کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد　　پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار　　خوشنویسوں کو ہے یہی آزار
الغرض جس کے پاس جو ہے چیز　　جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز
قوم پر ان کا کچھ نہیں احساں　　اُن کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں
قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی　　نام پر کیوں کہ جان کھوئے گی

تربیت یافتہ جو ہیں یاں کے　　خواہ بی اے ہوں اس میں یا ایم اے
بند اس قفل میں ہے علم ان کا　　جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا
کیجیے انصاف شرم کی جا ہے　　گر نہیں بخل تو یہ پھر کیا ہے!
تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ　　تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ
علم کو کر دو کو بکو ارزاں　　ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
گر رہا چاہتے ہو عزّت سے　　بھائیوں کو نکالو ذِلّت سے
قوم کا مبتذل ہے جو انساں　　بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم کی عزّت اب ہُنر سے ہے　　علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں یہ دور آئے گا　　بے ہُنر بھیک تک نہ پائے گا
گر نہیں سُنتے قول حالؔی کا　　پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

حالؔی کے ایک نقّاد نے لکھا ہے کہ مولانا کا کلام "اَن نیچرل" یعنی غیر فطری ہے۔ اور مثال میں حالؔی کا یہ مصرع پیش کیا ہے "اے شبِ ماہتاب تاروں بھری" اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ایک دوسرے نقّاد نے یہ عذر پیش کیا کہ مولانا نے "نیچر کا مطالعہ برگِ درختاں سے نہیں بلکہ اوراقِ کتب سے کیا ہے اسی لیے ایسی غلطی کر گئے"۔ حالانکہ جس کسی نے حالؔی کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ حالؔی نے جہاں کہیں مناظرِ فطرت کی عکاسی کی ہے وہاں نظروں کے سامنے ان کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس کے ہر جزو کا عینی مشاہدہ کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ عذر کہ حالؔی نے "برگِ درختاں" سے فطرت کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ اوراقِ کتب سے کیا ہے صحیح نہیں۔ حالؔی عالم بھی تھے اور شاعر بھی۔ مگر نہ تارک الدنیا عالم اور نہ دنیا سے بیزار شاعر۔ اور ان کی ساری زندگی اور سارا کلام اس کا شاہد ہے کہ انھوں نے فطرت کو، انسان کو، دنیا کو، زندگی کو گہری نظر سے دیکھا اور بغور مشاہدہ کیا ہے۔ اب ذرا اس اعتراض کو لیجیے۔ "شبِ ماہتاب تاروں بھری" کو "اَن نیچرل" سمجھنے والے نقّاد نے شاید "ماہتاب"

کے معنیٰ " بدر " کے سمجھے ہیں - اور یہ سمجھ کر اعتراض کیا ہے کہ بھلا ماہِ کامل کے وقت رات تاروں بھری کیسے ہوسکتی ہے؟ حالانکہ چاند خواہ وہ پہلی رات کا ہلال ہی کیوں نہ ہو تابناک ہوتا ہے اور چاند کی چھٹے سات تاریخ تک ماہتاب کی رات تاروں بھری ہوتی ہے - حالیؔ کی ساری نیچرل شاعری میں سے ایک مصرعہ لے کر اور اس کا بھی غلط مطلب سمجھ کر حالیؔ کو اُن نیچرل شاعر کہنا یا ان کو " اوراقِ کتب " سے فطرت کا مشاہدہ کرنے والا بتانا دونوں سطحی نظر پر دلالت کرتے ہیں -

حبِ وطن کو پڑھ کر یہ بات محسوس ہونے لگتی ہے کہ حالیؔ کے دل میں دردِ ملت اور اصلاحِ قوم کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے - اور اُن کا دل اس کی اصلاح کے لیے بے قرار ہے - شاعر کا ذہن نئی شاعری کو بھی قبول کر چکا ہے اور شعر و ادب کو زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی بھی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے - مگر ابھی تک مصلحانہ جوش، اپنے مشن کا احساس اور اپنی شاعری سے کام لینے کا کوئی واضح تصور اُن کے ذہن میں نہیں ہے - اور ہوتا بھی کیسے؟ قوم کی ابتر اور مایوس کن حالت وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے - اور رات کی تاریکی دور ہونے کی کوئی علامات ابھی تک اُفق پر نظر نہ آتی تھیں - چند نظمیں کہنے سے دل کو تسکین نہ ہوئی - لاہور سے دِلّی آ گئے - لیکن افسردہ اور بے دل - پرانا سرمایہ نکمّا نظر آتا تھا اور وہ نئی اُمنگ ابھی پوری طرح بیدار نہ ہوئی تھی جس نے حالیؔ کو حالیؔ بنایا - " بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکّر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے - جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں ؎

شکستِ رنگِ شباب و ہنوز رعنائی درآں دیار کہ زادی، ہنوز آں جائی

نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں، آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا - جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا - جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم

بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو اُن سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا - - - - - چند روز اسی تردّد میں گزرے کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا اور دوسرا پیچھے ہٹتا تھا - - - "[1]

[1] دیباچہ مسدس حالیؔ -

مسدسِ حالؔی

حالؔی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ اس زمانے میں ان کی ملاقات سرسیدؔ سے ہوگئی۔ اس ناخدا سے جس نے قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے میں اپنی جان لڑا رکھی تھی، اور جو تقریباً بیس برس سے اپنی جاہل، بے عمل، خوف زدہ اور شکست خوردہ قوم کو اُبھارنے اور سیدھے رستے پر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی "ایک[1] نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار راستے پر پڑ لیے ...... زمانے کا ٹھاٹ دیکھ کر پُرانی شاعری سے دل سیر ہوگیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا مگر یہ ایک ایسے ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے بخاراتِ اندرونی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچّے خیر خواہ نے ...... آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے ..... ہر چند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا، ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔

[1] دیباچہ مسدس حالؔی۔

دل ہی سے نکلی تھی دل ہی میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، اُنھیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدّس کی بنیاد ڈال دی ....."

اب حالؔی اپنی مسدّس کی دُھن میں لگ گئے۔ بیماریوں، پریشانیوں، مشکلوں سب نے زغنہ کیا لیکن ان کی ہمت کو مغلوب نہ کرسکیں۔ سرسیدؔ کی مضراب نے سازِ دل کے اس تار کو چھیڑ دیا جس میں نئے دلسوز نغمے چھپے ہوئے تھے .... اب شاعر کو وہ مقصدِ حیات معلوم ہو چکا تھا جس کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس عزم کا پہلا کارنامہ مسدّسِ حالؔی تھا۔

حالؔی نے جب یہ کتاب لکھی تو وہ جانتے تھے کہ وہ ملک کے سامنے شاعری کا ایک نیا نمونہ پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ قدامت پسند لوگ اس "بدعت" کو ناپسند کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے دیباچے میں لکھا بھی "ہمارے[1] ملک کے اہلِ مذاق ظاہراً اس روکھی پھیکی سیدھی سادھی نظم کو پسند نہ کریں گے۔ کیونکہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی، نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی .... گویا اہلِ دلّی اور اہلِ لکھنؤ کی دعوت میں ایسا دستر خوان چنا گیا ہے جس میں اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر اس نظم کی ترتیب واہ واہ سننے اور مزے لینے کے لیے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے ......"

حالؔی کا اندازہ ایک حد تک صحیح نکلا۔ جب یہ مسدّس جو اردو شاعری میں انقلاب کا عَلَم بردار تھا، ۱۸۷۹ء میں پہلی مرتبہ قوم کے ہاتھوں میں آیا تو سارے دیس میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ایک طبقہ ایسا تھا جسے مسدس میں سرتاپا عیب ہی عیب نظر آئے۔ لعن طعن، اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کا طوفان برپا ہوا۔ متعصب اور تنگ دل، تنگ نظر حضرات نے وہ شور مچایا کہ معلوم ہوتا تھا اس سیلاب میں مسدس کی ہستی خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گی۔ لیکن برخلاف اس کے بعض حلقوں میں اس

[1] دیباچہ مسدس حالؔی۔

کی بہت پُرجوش پذیرائی کی گئی اور یہ قوم کے لیے زندگی کا روح افزا پیام بن گیا۔ اُسے اس کی بدولت ایک ایسا راستہ نظر پڑا جس کو دل ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ مایوسی کے اندھیارے میں ایک نور کی کرن ثابت ہوا۔ اُس نے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ بات دل سے نکلی تھی سیدھی دل میں جا کر بیٹھی۔ مخالفت کے خس و خاشاک نے طوفان کا سا زور باندھا لیکن تھوڑے سے عرصے میں یہ طوفان جس کی حیثیت سمندر کے اوپر جھاگ کی سی تھی بیٹھ گیا اور حقیقت کا اعتراف کیا جانے لگا۔ عورت مرد، چھوٹے بڑے، امیر غریب، عالم، جاہل، خاص و عام سب اسے پڑھتے اور سر دُھنتے اور اپنی حالت پر آنسو بہاتے۔ میلادوں میں اس کے نعتیہ بند پڑھے جاتے تو مجلس جھوم اٹھتی۔ واعظ اس کی اخلاقی تعلیم سے اپنے وعظ میں اثر پیدا کرتے۔ قومی لیڈر قوم کو اصلاح و ترقی کا جوش دلانے کے لیے اس کے بند پڑھتے۔ سماع کی محفلوں میں مسدّس گایا جاتا تو راگ راگنی کے شیدا حضرات کچھ دیر کے لیے من کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آجاتے اور اپنی حالت پر آنسو بہانے لگتے۔ ایک طرف وہ صاحبِ ذوق حضرات کے لیے سرمایۂ ادب بنا تو دوسری طرف مدرسوں میں بچوّں کے نصاب میں داخل کیا گیا اور نئی نسل کی تعلیم میں اس سے مدد لی جانے لگی۔ چنانچہ اس "روکھی پھیکی" نظم نے تھوڑے ہی عرصے میں قبولیت کا وہ درجہ حاصل کر لیا جو اردو میں بلکہ شاید ہندوستان کی کسی زبان میں کسی دوسری نظم کو آج تک حاصل نہ ہوا تھا۔

حالیؔ نے جو "اُبالی کھچڑی اور بے مزہ سالن" اہلِ ذوق کے سامنے پیش کیا تھا اس کی اس درجہ قبولیت دیکھ کر وہ خود بھی حیران رہ گئے اور اس کی برکت سے قوم میں جو زندگی اور حرکت نظر آئی اس نے شاعر کے دل میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔ قوم میں بیداری کے آثار دیکھ کر، اُمّید کی اک نئی کرن حالیؔ کے سامنے چمکی چنانچہ انھوں نے بعد میں کچھ اور بند مسدّس میں اضافہ کیے جس میں قوم کو نااُمیدی کے بھنور سے نکل کر اُمید کا دامن تھامنے، اپنے چھپے ہوئے جوہروں کو پرکھنے اور سعی و عمل کی راہ میں گامزن ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ مسدّس گویا اُمید کا ایک منارہ تھا جو یاس و بے دلی کے سمندر میں ڈوبتے ہوؤں کی ہمت بندھا رہا تھا۔

مسدّس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا، پشتو کے ترجمے کے بارے میں تو مستند طور پر معلوم ہے کہ حالیؔ کے ایک دوست مولوی غلام محمد خاں صاحب نے پشتو میں اس کا منظوم ترجمہ کیا تھا اور مولانا

حالیؔ نے ایک موقعے پر اپنی دوسری تصانیف کے ساتھ امیر افغانستان کو ہدیتاً بھیجا تھا۔ اس تحفے کے بھیجنے کے سلسلے میں ایک جگہ اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں:

"مصنّف خود اپنی تصانیف کی نسبت جو کچھ کہے وہ قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ محسن الملک کو چوں کہ بہت سے ٹرسٹیوں کو (امیر افغانستان سے) انٹروڈیوس کرانا تھا اس لیے وہ میری نسبت اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکے کہ یہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں اور ہندوستان میں ان کا کوئی مثل نہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ ایشیائی شاعری جو محض ایک بیکار چیز تھی اس کو مفید بنایا گیا ہے اور اس کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کیا گیا ہے۔"[1]

اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالیؔ کو اپنی ذات کی تعریف سے زیادہ اس کام کی اہمیت کا احساس اور اس کی تعریف کی خواہش تھی جو انھوں نے انجام دیا تھا وہاں یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فن کار کیسا ہی منکسر المزاج اور حالیؔ جیسا ہی مستغنی المزاج کیوں نہ ہو اس کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے کام کی اہمیت اور عظمت کو لوگ سمجھیں۔

آیئے اب ذرا مسدّس کے موضوع پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالیں۔ شروع میں مسلمان قوم کی موجودہ ابتر حالت کا ایک مجمل اور مختصر سا خاکہ کھینچنے کے بعد شاعر ان کو عرب کی طرف لے جاتا ہے جو اُن کی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عرب کی کیا حالت تھی؟ پھر محمد عربی صلعم کے ظہور اور اُن کی تعلیم کا بڑے دلکش اور بڑے پُر اثر انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ مگر عقیدت کی فراوانی میں دیانت اور حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ پھر دکھایا ہے کہ کس طرح ہادیٔ برحق کی تعلیم نے ایک مُردہ قوم میں نئی روح پھونک دی اور اُس کی بدولت اسے دنیا میں کیسی عزت اور عظمت نصیب ہوئی۔ اس حصّے کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ اس میں حالیؔ نے اسلام کی تعلیم کا بڑا صحیح اور سچا نقشہ کھینچا ہے۔ "اسلام کی تعلیم کے رُخِ روشن پر زمانے کے تعصب، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے جو پردہ پڑ گیا تھا، حالیؔ نے اُس پردے کو اٹھا کر

---

[1] مسدس کی مصلحانہ شان۔ از خواجہ غلام السیدین۔

دکھا دیا کہ اسلام ایک مذہبِ امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبّت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصّب کو مٹانا اور ان میں ایک عالم گیر اخوت قائم کرنا تھا۔ اس نے فقیری میں خودداری اور جدّ و جہد، اور ثروت میں فیّاضی، خدا ترسی، اور خود شناسی سکھائی تھی۔ اُس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیا سے فکر و عمل کو مسخّر کر لیا تھا۔۔۔۔"

لیکن بعد میں جب اُمّت اپنے ہادیؐ کی تعلیم کو بھول گئی تو ؎

پہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا ۔۔۔ گیا چھوٹ سررشتہ دینِ ہُدیٰ کا

رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہُما کا ۔۔۔ تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک

وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

اور پھر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں جو پھوڑا مدّت سے ٹیسیں مار رہا تھا پھوٹ بہا ہے۔ اُس نے قوم کی بدحالی، پستی، اخلاقی گراوٹ، جہالت اور بے عملی کا وہ عبرت انگیز منظر دکھایا کہ ہر غیرت مند دل شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور اپنی اور قوم کی حالت پر شاعر کے ساتھ خون کے آنسو روتا نظر آتا ہے۔ قوم کے ہر طبقے اور ہر فرقے کی حالت کی مکمل تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے اور ہر ایک اُس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر شرم سے سر جھکا لیتا ہے۔ آخر میں ایک صاحبِ نظر فن کار کی ناامیدی میں اُمید کی کرن چمکا کر، محنت کی عظمت اور عمل کی برکت سمجھا کر، علم و عمل کے میدان میں قدم بڑھانے کا حوصلہ بندھا کر، بارگاہِ الٰہی میں قوم کے لیے دعا کرتے ہوئے شاعر رخصت ہو جاتا ہے۔

مسدّس کی اس درجہ قبولیت کی ایک بڑی وجہ تو اس کی حقیقت نگاری، صداقت، خلوص اور وہ درد و سوز ہے جو اس کے ہر ہر شعر میں جاری و ساری ہے۔ دوسری وجہ زبان و بیان کی سادگی، روانی، شیرینی اور وسعت ہے۔ حالیؔ کا پیام قوم کے کسی ایک طبقے یا فرقے کے نام نہ تھا اس لیے وہ اُسے کسی خاص اصطلاحی اور مشکل زبان میں ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کو تو پوری قوم کو اپنا

پیام پہنچانا تھا خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلّق رکھتے ہوں۔ اس لیے انھوں نے وہ زبان استعمال کی جسے ہر کس و ناکس آسانی سے سمجھ سکے۔" بیان کی سادگی اور صفائی، زبان کی سلاست اور نرمی اور گھلاوٹ حالیؔ کا حصّہ ہے۔" انھوں نے وہ الفاظ اور محاورے جو ادب میں متروک اور گھٹیا سمجھے جاتے تھے لیکن روزمرّہ کی زبان میں انھیں قبولیت حاصل تھی بے تکلّف استعمال کیے اور اس خوبی سے کہ جو لفظ جہاں بٹھا دیا گیا وہاں نگینے کی طرح جڑ گیا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق کے "زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو اس نظم (مسدّس) میں دیکھنی چاہیے جس میں مختلف قسم کے مضامین و واقعات نہایت بے تکلّفی اور روانی سے ادا کیے گئے ہیں۔ یہاں پر بیان کا تسلسل اور مضامین کی بلندی قابلِ دید ہے۔ نظم میں الفاظ کا صحیح استعمال جس طرح مولانا نے کیا ہے اور زبان کو اخلاقی اور حکیمانہ خیالات ادا کرنے کے لیے جس طرح وہ کام میں لائے ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ بہت سے الفاظ جو دربارِ فصاحت میں بار نہیں پا سکتے تھے اور جن کے جوہر ہم پر اب تک نہیں کھلے تھے مولانا نے ان کی قدر کی اور انھیں ایسے ٹھکانے بٹھایا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اُن کے ہاتھوں میں معمولی اور سادہ الفاظ جادو سا پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالیؔ نے زبان کو وسعت نہیں دی بلکہ ایک نئی زبان پیدا کی ہے۔۔۔۔"

ایک اور جگہ مولوی عبدالحق مسدّس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

" اس کی روانی حیرت انگیز ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحے کے لیے بھی رُکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ اُبل رہا ہے۔ باوجود ادبی خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم ہے کہ اس پر ہزار صنائع بدائع قربان ہیں۔ اور ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد صداقت پر ہے۔ ادب میں حسن و خوبی کا معیار صداقت یا حقیقت ہے۔

" ہماری شاعری میں مسدّس نظم کی ایک ایسی قسم ہے جس کا نبھانا آسان نہیں۔ اچھے مشّاق شاعر بھی رہ جاتے ہیں اور بھرتی کے مصرعوں سے چول بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیسؔ سا باکمال شاعر بھی، مسدّس جن کی مِلک ہو گئی ہے، بھرتی کے بے ربط مصرعے داخل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن حالیؔ کا کمال یہ ہے کہ سارے مسدّس میں مصرعہ تو کیا ایک لفظ بھی بھرتی کا نظر

نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اگرچہ میں مولانا عبدالحق کی اِس رائے سے بہ ادب اختلاف کروں گی کہ انھوں نے حالؔی کو انیسؔ سے بڑھا دیا ہے، اس لیے کہ انیسؔ کی عظمت اور حیثیت، مسدّس کے لاکھوں بندوں میں اُن کا حسن وکمال ایسا ہے جس کا مقابلہ اردو تو کیا شاید کسی زبان کا شاعر بھی ادا نہ کرسکے گا ــــ لیکن جہاں تک مسدّس حالؔی کے حسنِ بیان کا اظہار ہے اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے ؟

آج سے ستّر سال پہلے مسدّس پہلی بار شائع ہوا تھا ۔ اس وقت سے لے کر آج تک اُس کا جو اخلاقی اور اصلاحی اثر پڑا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے ۔ آئندہ بھی جب تک انسان میں اچھے اور بُرے، نیکی اور بدی میں تمیز کی، اور پستی سے بلندی کی طرف جانے کی صلاحیت موجود ہے اُدب میں مسدّس کا مقام محفوظ ہے ۔ جہاں ایک طرف اس کو قبولِ عام اور بقائے دوام کا درجہ حاصل ہوا ہے وہاں اس نے ہزاروں اہلِ دل، اہلِ قلم، اہلِ نظر اور صاحبِ ذوق لوگوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا ہے ۔ اب تک اُس کے سینکڑوں ایڈیشن اردو زبان میں چھپے ہیں اور شاید ہی کوئی ہندوستانی جاننے والا ایسا ہو جس نے سارا مسدّس یا اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ نہ پڑھا یا نہ سنا ہو ۔ ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں مسدّس کا ترجمہ ہو چکا ہے ۔ اور دوسرے ملکوں کے لوگ جو اردو زبان اور اردو ادب سے واقف ہیں اس کے رتبہ شناس ہیں ۔ اس ضمن میں وہ قصّہ قابلِ ذکر ہے جو مسدّس کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے بیان کیا تھا ۔

مولانا سندھی سالہا سال روس میں رہے تھے اور روسی زبان اچھی طرح جانتے تھے ۔ ان کے قیام میں روس میں ایک نمائش ہو رہی تھی جہاں ایک بہت بڑے ہال میں اس قسم کے تمام اقوال اور اشعار لکھ کر سجائے گئے تھے جن میں محنت اور مزدوری کی عظمت ظاہر کی گئی تھی ۔ مولانا نے جب اس نمائش کو دیکھا تو اپنے روسی دوستوں سے کہا کہ آپ کے ہاں تو اب چند سال سے یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ محنت قابلِ تعظیم ہے لیکن ہمارے دیس میں آج سے سو برس پہلے ایک ایسا شخص پیدا ہوا تھا جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اپنے کلام میں اس خیال کو بہت زور اور جوش کے ساتھ بیان کیا ہے اور محنتی اور کامی لوگوں کو اشرف ترین انسان کا درجہ دیا ہے ۔ لوگوں کو پہلے تو اُن

کی بات کا یقین ہی نہ آیا لیکن جب مولانا نے مسدّس کے چند بندوں کا ترجمہ کروا کے لوگوں کو دکھایا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی اور یہ اشعار اس درجہ پسند کیے گئے کہ اس تاریخی نمائش میں تمام اقوال و اشعار میں سب سے بلند اور باعزّت جگہ حالؔی کے اِن اشعار کو دی گئی ؎

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری ۔۔۔ جہاں دیکھیے فیض اِسی کا ہے جاری
یہی ہے کلیدِ درِ فضلِ باری ۔۔۔ اسی پر ہے موقوف عزّت تمھاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرُو سب
اسی پر ہیں مغرور مَیں اور تُو سب

گلستاں میں جوبن گُل و یاسمن کا ۔۔۔ سماں زُلفِ سنبل کی تاب وشکن کا
قدِ دلرُبا سرو اور نارون کا ۔۔۔ رُخِ جاں فزا لالہ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کا ہے رنگ و بو سب
کمیروں کے خوں سے ہیں یہ تازہ رو سب

مسدّس حالؔی صرف اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر ہی سے ایک بالکل جدید طرز کی چیز نہ تھی بلکہ حقیقت میں یہ ترقی پسند ادب اور نئی شاعری کا سنگِ بنیاد تھی ۔ جس تحریک کو ہم ترقی پسند تحریک کہتے ہیں دراصل آج سے ستّر سال پہلے حالؔی نے اس کی ابتدا کی تھی ۔ اگر آج ترقی پسند تحریک اشتراکیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ پون صدی پہلے بھی اس صورت میں یہ تحریک اٹھائی جاسکتی تھی ۔ حالؔی نے صرف ترقی کا راستہ نہیں دکھایا بلکہ دراصل ایک انقلاب کی بنا ڈالی ۔ انھوں نے صرف شعر کی دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کیا بلکہ شعر کے ذریعے انسانوں کے دماغوں اور ذہنوں میں بھی انقلاب کا بیج بویا ۔ ہاں حالؔی تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر کا کام بھی کرنا چاہتے تھے ۔ وہ فرسودہ عمارت کے پرانے مسالے سے ایک نئی اور پائدار عمارت بنانا چاہتے تھے ۔ ہمارے بعض نقاد بڑی بے تکلفی اور "بے غوری" سے آج کے معیاروں پر انیسویں صدی کے شعر و ادب کو پرکھتے ہیں اور جب پرانی اصلاحی اور انقلابی چیزیں اُن کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں تو بے تکلّف اُن کو کھوٹا سونا قرار دے

دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ سانچے، یہ معیار بہت بعد کے بنے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سماجی اور سیاسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ حالیؔ دراصل اپنے زمانے کے انقلابی، اور ترقی پسند تحریک کے بانی تھے۔ ہاں اُن کا معیار جُدا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ حالیؔ کہتے ہیں "جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرزِ بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیا اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیے تھے مگر اسلوبِ بیان میں مطلق فرق نہ آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجا، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات سے دست بردار ہو جائیں مگر اُن کے طریقۂ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے ......
نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کے طرزِ بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں ......" اس لیے حالیؔ نے معنی کی نئی شراب کو بھی پرانی بوتلوں یا اُن سے ملتے جُلتے پیمانوں میں پیش کیا اور اس طرح قبولیت کی راہ میں غیر ضروری اُلجھنیں نہیں پیدا کیں۔

مسدس میں بعض مقامات اپنی جگہ اتنے پُراثر، دلکش اور فنی اعتبار سے لاجواب ہیں کہ وہ اردو ادب کے لیے ہمیشہ سرمایۂ افتخار رہیں گے۔ پیغمبرِ اسلام محمد مصطفٰےؐ کی نعت میں شاعروں نے گزشتہ چودہ صدیوں میں کیا کچھ نہیں کہا! لیکن مسدس میں جو چند نعتیہ بند ہیں وہ ایک طرف عقیدت اور ارادت کی اور دوسری طرف حقیقت اور صداقت کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں:

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانبِ بُوقُبیس ابرِ رحمت
عطا خاکِ بطحا کو کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جس کی دیتے بشارت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ
ہوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت — کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت

نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت — کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت
یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماوےٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولےٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

مسلمانوں کے گزشتہ عروج کی تصویر دکھاتے ہیں تو کلام میں مردانہ جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور فصاحت کے دریا بہنے لگتے ہیں:

نہیں اس طبق پر کوئی برِّ اعظم — نہ ہوں جس میں ان کی عماراتِ محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم — بناؤں سے ہے ان کی معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا
ہُوا اندلس اُن سے گلزار یکسر — جہاں اُن کے آثار باقی ہیں اکثر

جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر یہ ہے بیتِ حمرا کی گویا زباں پر

کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی

عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

کوئی قرطبے کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں یوں ہے چمکتا

کہ ہو خاک میں جیسے کُندن دمکتا

اور اسلام کے باغِ ویراں کا نقشہ دیکھیے تو دِل ہل جاتا ہے ؎

پھر اک باغ دیکھے گا اُجڑا سراسر جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر

نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل

ہوئے رُوکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں جہاں آ کے دیتا ہے رُو ابرِ نیساں
تردّد سے جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آوازِ پیہم وہاں آ رہی ہے

کہ اسلام کا باغِ ویراں یہی ہے

وہ دینِ حجازی کا بیباک بیڑا نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا نہ عمّاں میں ٹھٹکا نہ قُلزم میں جھجکا

کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر

وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

اور جب اپنے دور کی شاعری کا پول کھولنے پر آتے ہیں تو گویا دنیائے شعر سرنگوں ہو جاتی ہے ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلے میں سراسر ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا

وہ ہے ہفت نظر علم و انشا ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرّر جہاں نیک و بد کی جزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے

جہنّم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

مسلمانوں کی پستی کی تصویر دکھاتے وقت حالیؔ کا قلم تلخ سے تلخ تر ہو جاتا ہے لیکن اس کا سب سے سخت حصّہ وہ ہے جہاں وہ شاعروں کی ہجو کرتے ہیں" اس لیے کہ یہاں ملامتِ غیر نہیں ملامتِ نفس مقصود تھی۔ اس کے باوجود الفاظ کی سختی سے قطع نظر کیجیے تو واقعات کے بیان میں یہاں بھی اصلیت سے انحراف نہ پائیے گا۔" مبالغہ جو شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے حالیؔ کے ہاں بس آٹے میں نمک برابر ہی ہوتا ہے۔

اپنی قوم کا ایک ایک عیب عبرت ناک انداز سے دکھانے کے بعد کس درد سے کہتے ہیں ؎

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے کوئی اُن میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مستِ خوابِ گراں ہیں

جو بیدار ہیں اُن پہ خندہ زناں ہیں

کوئی اُن سے پوچھے کہ اے ہوش والو کس امّید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
بُرا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچوگے نہ تم اور نہ ساتھی تمھارے

اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں   بہت بوجھ بار اپنا لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں   بہت سے نہ چلنے سے پچھتا رہے ہیں

مگر اک تمھیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوتی ہو منزل

امیروں کی تم سُن چکے داستاں سب   چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب   بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیاریاں سب

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل سے ہٹ چکا ہے

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے   سرانجامِ ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانے کی عادت یہی ہے   طلسمِ جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے   جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے   نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے

مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

آخر میں دِلوں کو جو یاس کے دریا میں ہچکولے کھا رہے تھے اُمید کا حسین چہرہ دِکھا کر پھر سے تازہ دم کر دیتے ہیں سے

بس اے نا اُمیدی نہ یوں دل بُجھا تو   جھلک اے اُمید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا اُمیدوں کو ڈھارس بندھا تو   فسردہ دِلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے   بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُکھڑتے دِلوں کو جمایا ہے تو نے   اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی   بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی
تجھی پر ہے بنیاد نظمِ جہاں کی   نہ ہو تو، تو رونق نہ ہو اس مکاں کی

تگا پو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رَوا رَو ہے ہر قافلے میں تجھی سے

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے   عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہ نموں ہے   تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مگر اے اُمید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دُنیا میں سارا ہے تیرا

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی   نہ اُس میں وہ اسلام کی شان باقی
نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی   پر اس حال میں بھی ہے اک آن باقی

بگڑنے کا گو اُن کے وقت آ گیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی   دلیری نہیں پر حمیت ہے باقی
فقیری میں بھی بوئے ثروت ہے باقی   تہی دست ہیں پر مروت ہے باقی

مٹے پر بھی پندارِ ہستی وہی ہے
مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحطِ انساں   نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں
سفال و خزف کے ہیں انبار گویاں   جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں اُن میں پنہاں

چھپے سنگ ریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزۂ زر بھی ہیں کچھ

جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا — کہ اک اک نے ملکوں کو ہے یاں جگایا
اکیلوں نے ہے قافلوں کو بچایا — جہازوں کو ہے زور قوں نے ترایا
یوں ہی کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیے سے دیا یونہی جلتا رہا ہے

حوادث نے اُن کو ڈرایا ہے کچھ کچھ — مصائب نے نیچا دِکھایا ہے کچھ کچھ
ضرورت نے رستہ دِکھایا ہے کچھ کچھ — زمانے کے غُل نے جگایا ہے کچھ کچھ
ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سوتے میں کچھ کلبلانے لگے ہیں

یہ مانا کہ کم ہم میں ہیں ایسے دانا — جنھوں نے حقیقت کو ہے اپنی چھانا
تنزّل کو ہے ٹھیک ٹھیک اپنے جانا — کہ ہیں ہم کہاں اور کہاں ہے زمانا
پہ اتنا زبانوں پہ ہے سب کے جاری
کہ حالت بُری آج کل ہے ہماری

ذرا پھر کے پیچھے وہ جب دیکھتے ہیں — وہ اپنا حسب اور نسب دیکھتے ہیں
بزرگوں کا علم و ادب دیکھتے ہیں — سرافرازیٔ جدّ و اب دیکھتے ہیں
تو ہیں فخر سے وہ کبھی سر اُٹھاتے
کبھی ہیں ندامت سے گردن جھکاتے

اگر کچھ بھی باقی ہے یاروں میں ہمّت — تو اُن کا یہی افتخار اور ندامت
شگونِ سعادت ہے اور فالِ دولت — کہ آتی ہے کچھ اس سے بوئے حمیّت
وہ کھو بیٹھے آخر کمائی بڑوں کی
بھلا دی جنھوں نے بڑائی بڑوں کی

اگر باخبر ہیں حقیقت سے اپنی — تلف کی ہوئی اگلی عظمت سے اپنی
بلندی و پستی کی نسبت سے اپنی — گزشتہ و آئندہ حالت سے اپنی
تو سمجھو کہ ہے پار کھیوا ہمارا
نہیں دور منجدھار سے کچھ کنارا

مسدّس کے بارے میں رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے "یہ ایک الہامی کتاب ہے۔ اس کو تاریخ ارتقائے ادبِ اردو میں ایک سنگِ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک تارا ہے جو اردو کے اُفقِ شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی" اور ساتھ ہی اُن کو اس کا اعتراف بھی ہے کہ "ان کے مخاطب اُن کے اہلِ مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہلِ وطن ہیں ...."

یہ آخری ریمارک غور کے قابل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالؔی کے پیشِ نظر مسلمانوں کی حالتِ زار تھی اور اُن کی اصلاح ان کا مقصدِ اوّل تھا لیکن وہ اُن کے عروج و زوال کی جو داستان پیش کرتے ہیں وہ تاریخِ عالم کا ایک روشن اور عبرت انگیز حصّہ ہے اور اس کا مطالعہ انسان کی تہذیبی میراث کا جزو ہے، جو صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ سب قوموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ قومی عروج و زوال کے جو اصول اور اسباب اس میں سمجھائے گئے ہیں ان کا اطلاق عام ہے۔ اس کے علاوہ جن قدروں کو انھوں نے پیش کیا ہے اور جس انداز سے پیش کیا ہے وہ بھی زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ محنت، اکلِ حلال، دیانت داری، اخوّت، انصاف، سماجی برابری، علم کا احترام، دولت اور نام و نسب کی بے جا پاسداری کے خطرے۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا ہر قوم کے لیے ضروری ہے۔ اگر ان کو کسی خاص قوم یا مذہب کی اصطلاحوں میں بیان کیا جائے (اور برخلاف اقبالؔ کے حالؔی کے ہاں تو اصطلاحیں بھی بہت کم ہیں اور ان کی شاعری کی زبان ایک عالمگیر زبان ہے) تو اس سے ان کی قدریں کم نہیں ہو جاتیں۔

حالؔی کی مثنویاں اور دوسری نظمیں

مسدّسِ حالؔی اردو کی قومی شاعری کا سنگِ بنیاد تھا۔ اب حالؔی سرسیّد کے مشن میں برابر کے شریک ہوگئے اور انھوں نے اپنی شاعری کو قومی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ قومی خدمت کا تصوّر حالؔی کے ذہن میں یہ تھا کہ سرسیّد کی تعلیمی تحریک کی تائید کرکے قوم کو تعلیم کی طرف توجّہ دلائیں۔ جہالت کی تاریکی کو دور کریں اور لوگوں کو معاشرتی اور معاشی اصلاح کی ضرورت کا احساس دلائیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ قومی زندگی کی تشکیل اور ترقی اسی پر منحصر ہے کہ وہ زمانے کے تقاضے اور مطالبے کو سمجھیں اور اس کو پورا کریں۔ اور اگر اب بھی قدامت پرستی نہ چھوڑی، پرانی روایات کی پابندی پر اڑے رہے اور نئی تحریکوں کی مخالفت اور ان سے نفرت کرتے رہے تو ان کی بقا خطرے میں پڑجائے گی۔

اس سلسلے میں حالؔی نے بہت سی نظمیں اور مثنویاں لکھیں جن میں سے بعض بہت مشہور ہوئیں۔ ان سب کی تہہ میں یہی جذبہ اور یہی روح کارفرما ہے۔ اب ان کی شاعری ارادی طور پر بامقصد شاعری بن گئی اور گو اس پر ان لوگوں نے بہت اعتراض کیے جو آرٹ برائے آرٹ کے قائل تھے لیکن حالؔی کو اپنے کام سے کام تھا۔ اور زمانے نے ثابت کردیا کہ انھوں نے جو راستہ اپنے لیے اختیار کیا وہی صحیح اور سیدھا راستہ تھا اور ان کے مخالفین ایک فرسودہ روایت کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے تھے۔

ایک ترکیب بند جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں پڑھا گیا تھا اس کے کچھ شعروں سے ان کی اس جدید تحریک کے رُخ کا اندازہ ہوگا۔ مولانا حالؔی نے اس نظم پر ایک نوٹ اپنے دیوان میں لکھا ہے۔ "اس نظم میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیاء دونوں کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور "سلف ہلپ" سے دولت، عزّت، نیک نامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کرکے ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا ہو۔ ادنیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں بڑھ سکتے۔ اعلیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت و عزّت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اس حالت پر قائم رہنے کی فکر اور اس سے تنزّل کرنے کا کچھ انسداد نہیں کرتے۔" ؎

شکر اس نعمت کا یارب کرسکے کیونکر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقّت تو نے دیں
تاکہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہم پر عیاں

راحتیں اکثر میسّر آئیں تکلیفوں کے بعد
تاکہ کھو بیٹھیں نہ ہم ان راحتوں کو رائیگاں

افلاس سے پناہ مانگتے ہیں ؎

الحذر اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
لومڑی جاتے ہیں بن جس کی بدولت شیرِ نر

لیکن فقر سے بھی زیادہ خطرناک چیز انھیں کیا نظر آتی ہے؟ ؎

گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا
تھا مگر ثروت میں اس سے بھی زیادہ شور و شر

فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت، سو اس کے شکر کی طاقت نہیں

نشّۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں آنا محال
اس مئے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال

نفسِ امّارہ اور اس پر چھیڑ مال و جاہ کی
ڈھیر ہے بارود کا دیجیے پتنگا جس میں ڈال

باڑھ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اس قدر
جس قدر ثروت میں ہے دشوار پاسِ اعتدال

گلشنِ دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر
دیکھ اے روباہِ نفسِ دوں، حذر اُن سے حذر

اور پھر اُس درمیانی زندگی کی جنّت کی جھلک دیکھیے جو مخلتی لوگ اپنی قوتِ بازو سے حاصل کرتے ہیں ؎

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی — فقر کی ذلّت سے اور ثروت کے فتنے سے بری
رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین — ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مہلک سے بری
لذّتِ فقر و غنا دونوں سے ہیں وہ آشنا — اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی
جو گزرتی ہے گدا پر اُس سے ہیں وہ باخبر — کیونکہ حالت گاہ گاہ اُن پر بھی گزری ہے یہی
امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے — کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کی بدمستی وہی
اس لیے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابنائے جنس — جوشِ ہمدردی سے بے کل اُن کا ہو جاتا ہے جی
اور نہیں کرتے زبانِ طعن، بے دردی سے وا — جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی از خود رفتگی

اور اب اُن لوگوں کا مقام دیکھیے جن کو نہ دولت و ثروت نے مغرور اور بے حس کیا ہے نہ انتہائی افلاس نے بے کار اور پامال ؎

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمّت اِن سے ہے — منتظم ہر قوم و ملّت کی جماعت ان سے ہے
مشکلیں اکثر انھیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل — بھائیوں کے بازوؤں میں زورِ طاقت ان سے ہے
ہاتھ میں ان کے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام — عقل و دانش میں ہے جن ملکوں کی شہرت ان سے ہے
یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں — رونقِ بازارِ جنسِ علم و حکمت ان سے ہے
پاؤ گے اِن میں طبیب، ان میں ادیب، ان میں خطیب — ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے
کرتے ہیں اخلاقِ ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ — آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے

پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قوموں میں یکرنگی و وحدت ان سے ہے

اور پھر اُنھیں خطاب کر کے کہتے ہیں ؎

قوم کو ہے اُس جس سے وہ جماعت ہے یہی — جس سے جان آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
اتفاقِ قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل — رائی کو کرتی ہے جو پربت، وہ قوّت ہے یہی

قوم کی خدمت میں مضمر ہے ربوبیّت کی شان — جو کہ بجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی
قوم کی ذلّت کو سمجھیں ذلّت اپنی سب عزیز — ملک میں عزّت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی

ایک دوسری نظم جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں پڑھی گئی اس سے بھی زیادہ پُر اثر ہے اور ساتھ ہی دلآویز ہے ؎

یہ خاک آج جس پر ہیں جمع اہلِ آرا — یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گزر چکی ہیں — آنکھوں کے رُو برو ہے گویا سماں وہ سارا

اے خاکِ پاکِ دہلی، اے تخت گاہِ شاہاں — پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں
ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سُو — پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یاں

شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے — شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے
دولت کے تھے وہ جلوے ملّت کا ہے یہ نقشہ — کاغذ کی تھیں وہ ناویں، بیڑا یہ نوح کا ہے
بے روح تھے وہ قالب، ہے اس میں روحِ خویشی — موجِ سراب تھے وہ، یہ چشمۂ بقا ہے
میلے نہ وہ بچھڑتے روح اُن میں گر یہ ہوتی — رہتا ہے آندھیوں میں روشن یہ وہ دیا ہے
وہ دن گئے کہ ناناں تھی قوم سلطنت پر — اب قوم کو خدا کا، یا اپنا آسرا ہے
قدر ایسی مجلسوں کی مدّت میں جا کے ہوگی — اب تک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے
گو سب جہاز والے خطرے سے بے خبر ہیں — پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب — ہنستے ہیں ناخدا پر، رُوتا ہے ناخدا جب

گلشن میں فصلِ گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں — پرچین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں — اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں
غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی — بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اَب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں
دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو — ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں
جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں
یہ غفلتیں مبادا کچھ روزِ بد دکھائیں — ڈھونڈے سے کچھ نشاں ہیں تو رہے کہ مٹ نہ جائیں

معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں حالیؔ کو سب سے زیادہ فکر عورتوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے اور انھیں وہ انسانی حقوق واپس دلانے کی تھی جو مردوں کی خودغرضی نے اُن سے چھین لیے تھے اور جن سے جہالت کے سبب، وہ خود بھی بے خبر تھیں۔

حالیؔ سے پہلے اردو شاعری میں عورت کا کوئی خاص مقام نہ تھا۔ اُس کا ذکر آتا بھی ہے تو محض محبوب کی حیثیت سے اور وہ بھی کوئی اونچے کردار اور اخلاق کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اس کی حرکتوں میں شریف عورت سے زیادہ طوائف جھلکتی ہے۔ اُس کی اصلی صفات ایثار، قربانی، جفاکشی، محنت، وفا، پرستش، محبت، خدمت کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے اس کا جو بلند کردار ساری دنیا کی تاریخ میں عموماً اور ہندوستان کی تاریخ میں خصوصاً رہا ہے، اس کا اشارہ بھی شاید ہی کہیں مل سکے۔ کوئی بدیسی اگر ہمارے اُس وقت کے سارے اردو شاعری کے خزانے کو کھنگالے تو اس کو یہ رائے قائم کرنی پڑے کہ اس قوم میں عورت کا نہ کوئی درجہ ہے نہ اخلاق، نہ اہمیت ہے نہ کوئی حیثیت۔ اور جو عورت اُسے ملے گی وہ اوّل تو بدترین صفات کی حامل نظر آئے گی دوسرے اُسے عورت کہنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس میں زنانہ و مردانہ صفات کچھ اس طرح ملی جلی ہوئی ہیں کہ اُسے ہیجڑے قسم کی کوئی مخلوق کہا جا سکتا ہے جس پر اردو کا شاعر دل و جان سے فدا ہوتا ہے، اُسے پُوجتا ہے، جان نچھاور کرتا ہے، اس کے ظلم و ستم سہتا ہے اور پھر بھی اُسی کا رہتا ہے۔

اس اندھیرے میں صرف نور کی ایک کرن دکھائی دیتی ہے اور وہ ہے انیسؔ کی شاعری۔

انیسؔ نے مرثیے کے محدود میدان میں شاعری کے وہ بلند ترین نمونے پیش کیے ہیں جن پر اردو شاعری ہمیشہ ناز کرے گی اور جن کا جواب پورے اردو ادب میں بلکہ یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ پورے ہندوستان کے ادب میں نہیں مل سکتا۔ انیسؔ باوجود مذہبی شاعر ہونے کے آسمانِ ادب کے آفتابِ جہاں تاب ہیں۔ اسی محدود میدان (یعنی مرثیے میں) میں انیسؔ نے عورت کا ایک ایسا بلند اور مثالی کردار پیش کیا ہے جس کی مثال دنیا کی شاعری میں نہیں مل سکے گا۔

عورت اُن کے یہاں جب جلوہ نما ہوتی ہے، خواہ ماں کے روپ میں ہو یا بہن کے، بیوی کے بھیس میں آئے یا بیٹی کے، کنیز ہو یا شہزادی، وہ ایثار و قربانی، محبت و شفقت، خدا پرستی و انسان دوستی، فرض شناسی اور حق پرستی اور ساتھ ہی ہمت و شجاعت، دلیری و حق گوئی کا ایسا دلکش نمونہ ہوتی ہے جس کے سامنے ہر شخص کا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور اُس کی آنکھیں اُن محترم ہستیوں کی عقیدت اور محبت میں بھیگ جاتی ہیں۔ لیکن انیسؔ کے ہاں کے عورت کے یہ کردار محمد صلی اللہ وعلیہ وآلہٖ وسلم کے خاندان کی اُن بے مثال ہستیوں میں سے لیے گئے جن کی مثل عقیدتاً بھی اور واقعتاً بھی دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ اگرچہ ان کرداروں میں ہمیں ہندوستانی نقش و نگار نظر آجاتے ہیں مگر پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں ہندوستان کی عورت کا رُوپ دکھایا گیا ہے۔

لیکن حالیؔ نے اس عظیم غلطی کی تلافی کی اور اردو شاعری میں ہندوستانی عورت کو اس شان سے جلوہ گر کیا کہ ساری پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کر ڈالی۔ وہ جہاں کہیں عورت کا ذکر کرتے ہیں اُسے انسانیت کے بلند ترین مقام پر جگہ دیتے نظر آتے ہیں۔

"چپ کی داد" اُن کی مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے ہندوستانی عورت کی سیرت اور اُس کی خدمات پر روشنی ڈال کر اُن محرومیوں اور حق تلفیوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے ساتھ روا رکھی جاتی تھیں۔ ذرا چند بند دیکھیے۔ کس جوش اور خلوص سے عورت کی فطری صفات کی ثناخوانی کرتے ہیں۔ محبت و احترام لفظ لفظ سے ٹپک رہا ہے ؎

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے — ملکوں کی بستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو ‏ ‏ ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا ‏ ‏ گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم لاچار کی ‏ ‏ دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے

اس نظم میں حالی نے عورت کا ہر ہر روپ اس طرح دکھایا ہے کہ اس کی مکمل اور دلکش شخصیت نظروں میں پھر جاتی ہے۔

ہندوستانی بیٹی کا خاموش مگر زبردست کردار دیکھیے :۔

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں، بچپن سے خدمتگار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں ماؤں کی تابعدار تم
دن بھر پکانا ریندھنا، سینا پرونا ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر میں باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے سے جاگا اور ہوئیں بیدار تم

اور شادی کے بعد لڑکی کو سسرال میں جو کچھ جھیلنا پڑتا ہے اس کو وہ کس صبر اور خوبی سے سہارتی ہے :۔

واں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر، سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
بالا بڑوں سے گر پڑے، بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو گو دل میں ہو بیزار تم

اور جب ماں بننے کا اعزاز اُسے عطا ہوتا ہے تو :۔

کھانا، پہننا، اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم
بچوں کے دھندے میں تمھیں اپنی نہ کچھ سدھ بدھ رہی
تب تک بھی کچھ خیر تھی، جب تک بھلے چنگے تھے سب
پر سامنا آفت کا تھا، اگر ہو گیا ماندہ کوئی
سولی پہ دن کٹنے لگے راتوں کی نیندیں اڑ گئیں
اک اک برس کا ہو گیا ایک ایک پل اک اک گھڑی
بچوں کی سیوا میں تمھیں گزرے ہیں جیسے دس برس
قدر اس کی جانے گا وہی دم پر ہو یوں جس کے بنی
کی ہے مہم جو تم نے سر، مردوں کو اس کی کیا خبر؟
جانے پرائی پیر وہ جس کی بوائی ہو پھٹی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

پھر ایک دوسرے بند میں ماں کا وہ بلند درجہ دکھاتے ہیں جو اولیاء اور انبیاء سے بھی بڑھ گیا ہے :۔

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں یاں ‏ ‏ خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے ‏ ‏ ظلمت میں باطل کی ہُوا، دنیا پہ نورِ حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے ‏ ‏ ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں
کیا صوفیانِ باصفا، کیا عارفانِ باخدا ‏ ‏ کیا انبیاء، کیا اولیاء، کیا غوث کیا قطبِ زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے ‏ ‏ وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

اور وہ اس کی ایک ایک خوبی گنا کر اس کو دنیا کا سب سے بڑا اعزاز بخش دیتے ہیں ؎

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے بسر ‏ ‏ زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخرِ بنی نوعِ بشر

لیکن ان ساری خوبیوں، سارے ایثار اور خدمت کا صلہ دنیا نے اُسے کیا دیا؟ ؎

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں ‏ ‏ آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات ‏ ‏ ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب ‏ ‏ دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

اور یہ بھی حالیؔ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ؎

گزرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں ‏ ‏ تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب ‏ ‏ تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں

لیکن حالیؔ نے یہ بھی محسوس کیا ؎

نوبت تمھاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے ‏ ‏ انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمھارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا ‏ ‏ پر حل ہر اک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا ‏ ‏ پر فتح جب پائی ہے سچائی نے آخر پائی ہے

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی عورت کے حقوق کی حفاظت کی (اور یاد رکھیے یہاں مسلمان عورت کا سوال نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ہر عورت کی حمایت پیشِ نظر ہے) سب سے پہلی آواز جس شخص نے بلند کی اور اُس کی سماجی مظلومی کا سب سے پہلے اعتراف کیا اور اس کی حمایت کا علَم اٹھایا وہ حالیؔ ہی تھے۔

حالیؔ کی بہت سی نظموں اور مثنویوں میں سب سے دل گداز اور اثر آفریں "مناجات بیوہ" ہے جو زبان و بیان کی سادگی، روانی اور دلکشی کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس کا ترجمہ اکثر ہندوستانی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس نظم پر جو ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۷ء میں لکھی گئی حالیؔ کو ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ اس میں انھوں نے ایک کم سن بیوہ کی دردناک حالت کا نقشہ کھینچا ہے جو سماج اور رواج کے ظلموں کا شکار ہے۔ اور اس انداز سے کھینچا ہے کہ دل کانپ اٹھتا ہے۔

مولوی عبدالحق کی رائے ہے کہ "'مناجاتِ بیوہ' اور 'چپ کی داد' دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا، ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرعے سے خلوص جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی اُنھیں بے چشمِ نم پڑھ بھی نہیں سکتا......"

"تاریخ ادب اردو" میں رام بابو سکسینہ نے بھی مناجاتِ بیوہ کی تعریف کچھ اسی انداز میں کی ہے "اس کو پڑھ کر پاشن کر دل پھٹ جاتا ہے...... کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے......" خیر یہ تو لطفِ بیان کے لیے ایک بات کہی گئی لیکن اس میں شک نہیں کہ خود بیوہ اور سماج کی ستم رسیدہ عورتیں کیا سہاگنیں اور کیا کنواری لڑکیاں اسے پڑھ کر اپنے آنسو نہیں روک سکتیں۔ بلکہ وہ مرد بھی جو ان مظالم کے بانی ہیں اس نظم کو پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مجھے "مناجاتِ بیوہ" پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالیؔ باوجود مرد ہونے کے ایسا دردآشنا، ایسا حساس، اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کم سِن بدنصیب بیوہ عورتوں کے صحیح جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ سب کچھ خود اُس پر بیت چکا ہو۔ لیکن یہی تو اصلی شاعر کا کمال ہے کہ ہر ایک کی بپتی خود اس پر گزرتی ہے اور تب ہی وہ ایسی زندۂ جاوید چیز لکھ سکتا ہے جیسی "مناجاتِ بیوہ"۔

اس نظم کا ہندوستان کی دس بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور سنسکرت میں بھی ترجمہ کی جا چکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ نظم ہر ایک زبان میں اتنی ہی مقبول ہوئی ہوگی جتنی اردو میں ہوئی۔ اس لیے کہ بیوہ عورت کی جو حالت اس میں دکھائی گئی ہے وہ ہندوستان کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے اور یہ دردناک تصویر ہر جگہ کی بیوہ عورت کی حالت کا آئینہ ہے۔

اس نظم کی زبان اور بیان کی سادگی ایک معجزہ ہے اس کو پڑھ کر بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ آج سے ساٹھ برس پہلے حالیؔ ہی نے "ہندوستانی" زبان کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کی سادہ، سہل، دلنشیں اور رواں زبان میں ہندی کے سینکڑوں شیریں لفظ بے تکلف لیکن

نہایت برمحل استعمال ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ مہاتما گاندھی نے مولوی عبدالحق سے پوچھا تھا کہ اردو سیکھنے کے لیے میں کون سی کتاب پڑھوں تو مولوی عبدالحق نے اُن سے کہا کہ حالؔی کی "مناجاتِ بیوہ" کیوں کہ اگر بدقسمت ہندوستان کی کبھی کوئی مشترک زبان ہوئی تو وہی ہو گی جو اس نظم کی ہے۔ بے تعصبی کے ساتھ نظم کو پڑھیں تو اس دعوے میں مبالغہ نہیں معلوم ہوگا۔

حالؔی نے اس نظم کے لیے انداز بیان بھی وہ اختیار کیا ہے جس سے زیادہ موزوں اور موثر طرزِ بیان اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک سماج کی ٹھکرائی، مصیبت کی ماری، ستم زدہ بیوہ جس کی دنیا میں نہیں داد ہے نہ فریاد سوا اپنے پالن ہارکے اور کس سے شکوہ کر سکتی ہے؟ کس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ سکتی ہے؟ وہ اُسی سے اپنی دردناک حالت بیان کرتی ہے، شکایت کرتی ہے اور دعا کرتی ہے۔ ایک ایک شعر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل چیر کر نکلا ہے اور قاری کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے ؎

اے مرے زور اور قدرت والے   حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دُکھیاری   دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن   جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں   دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے   مُنہ میں بول نہیں ہیں اتنے
تجھ پہ ہے روشن سب دُکھ دل کا   تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا؟
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے   لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی سُکھ پاس نہ آیا   غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے   ایک ہنسی نے گُل یہ کھلائے
چین سے رہنے دیا نہ جی کو   کر دیا ملیامیٹ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک   اور رُووں تو رُووں کہاں تک

ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا   ایک نہ ہنستا، بھلا، نہ روتا
دن ہیں بھیانک رات ڈراونی   یوں گزری یہ ساری جوانی
کوئی نہیں دل کا بہلاوا   آ نہیں چکتا میرا بلاوا۔
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا   کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا

ان چند شعروں کو پڑھ کر پتھّر کا دل بھی پگھل سکتا ہے ؎

سیلانی جب باغ میں آئے   پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں   جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم   پیت ہوئی تو گنوایا پیتم

گھر برکھا اور پیا بدیسی   آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
شرط سے پہلے بازی ہاری   بیاہ ہوا اور رہی کنواری
خیر سے ہے بچپن کا رنڈاپا   دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عُمر ہے منزل تک پہنچانی   کاٹنی ہے بھرپور جوانی

شکایت میں بھی عقیدت و احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا:

دین سے تیری اے مرے مولا   سب ہیں نہال ادنیٰ اور اعلیٰ
سب کو ترے انعام تھے شامل   میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
گر کچھ آتا بانٹ میں میری   سب کچھ تھا سرکار میں تیری
پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں   آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
اُن کے آخر میں نے کیا کیا   مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا
رہی اکیلی بھری سبھا میں   پیاسی رہی بہتی گنگا میں
آئے خوشی سی چیز نہ پائی   جیسی آئی ویسی نہ آئی
چین گر اپنی بانٹ میں آتا   کیوں تو عورت ذات بناتا

کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے — کیوں ہوتے اوروں کے حوالے
دُکھ میں نہیں یاں کوئی کسی کا — باپ نہ ماں ، بھائی نہ بھتیجا
سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی — سُکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی

ایک نوجوان عفیفہ بیوگی میں کس طرح اپنے فطری جذبات کو دباتی ، نفس کو کچلتی اور جنسی خواہشات کو سُلاتی اور کس طرح پاک صاف زندگی گزارتی ہے ؟ یہ ایک ایسا سخت مرحلہ ہے جس کو سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں - جس پر بیتے وہ ہی جانے - مگر حالیؔ اس مقام سے بھی بڑے کمال کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں ؎

میں نہیں آخر پاک بدی سے — بنی ہوں پانی اور مٹّی سے
کان اور آنکھیں ، ہاتھ اور بازو — جن جن پر تھا یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا — سب کو خودی سے میں نے ہٹایا
اُٹھتے بیٹھتے روکا سب کو ، — سوتے جاگتے ٹوکا سب کو
ہاتھ کو ہلنے دیا نہ بے جا — پاؤں کو چلنے دیا نہ ٹیڑھا
روک کے یوں اور تھام کے آپا — میں نے کاٹا اپنا رنڈاپا

لیکن دل کو کیا کرے جو بیوہ کا بھی اسی طرح محبّت اور رفاقت کی طلب رکھتا ہے جس طرح کسی اور انسان کا :

ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا — تھا بے تاب جو اندر والا
حال کروں میں دل کا بیاں کیا ؟ — حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا ؟
دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی — مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی — اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی

کتنی مکمّل تشبیہ ہے ، کس لطافت اور اشاریت کے ساتھ نوجوان بیوہ کی تڑپ طلب اور بے بسی کا مرقع کھینچ دیا ہے ؎

گو دم بھر اس دل کی لگی نے — ٹھنڈا پانی دیا نہ پینے

میں نے کہا دل کا نہیں مانا — تو ہے مگر اس بات کا دانا

اور پھر اپنے دردِ دل کا بیان کرتے کرتے اپنی جیسی دوسری بہنوں کے خیال سے اس کا دل تڑپ اُٹھتا ہے ؎

اپنے لیے کچھ کہہ نہیں سکتی — پر یہ کہے بن رہ نہیں سکتی
میں ہی اکیلی نہیں ہوں دُکھیا — پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا
بالیاں اک اک ذات کی لاکھوں — بیاہیاں اک اک رات کی لاکھوں
ہو گئیں آخر اسی الم میں — کاٹ گئیں عمریں اسی غم میں
سینکڑوں بے چاری مظلومیں — بھولی ، نادانیں ، معصومیں
بیاہ سے انجان اور منگنی سے — بنے سے واقف اور نہ بنی سے
وو دو دن رہ رہ کے سہاگن — جنم جنم کو ہوئیں بروگن
شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہیں کنواری
آئیں بلکتی ، گئیں سسکتی — رہیں ترستی اور پھڑکتی
کوئی نہیں جو غور کرے اب — نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب
چوٹ نہ جن کے جی کو لگی ہو — وہ کیا جانیں دل کی لگی کو

بیوہ کو اپنی اس حالت سے پناہ صرف اس میں نظر آتی ہے کہ اپنی زندگی اور جوانی خدا کی محبّت میں کھپا دے ؎

ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے
تیرے سوا یاں اے مرے مولا — کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا
چاہتی ہوں اک تیری محبّت — اور نہیں رکھتی کوئی حاجت

گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے تیرے سوا جو سب کو بھلا دے
کوئی جگہ اس دل میں نہ پائے یاد کوئی بھولے سے نہ آئے
دل میں لگن بس اپنی لگا دے سارے غم اپنے غم میں کھپا دے

بچپن کی شادی کی لعنت اور بیوہ کی شادی کی مخالفت جو ہندوستان کی تہذیب پر ایک بدترین داغ ہے، جس نے کروڑوں معصوم زندگیاں تباہ و برباد کر دیں۔ ان مذموم رسموں کے خلاف سب سے پہلی آواز جو بلند ہوئی وہ حالیؔ کی تھی۔ یہی آواز تھی جو بعد میں اصلاحِ رسوم و اصلاحِ معاشرت کی صورت میں مہاتما گاندھی کے گلے سے نکلی تھی۔ یہی پہلی تحریک تھی جس نے آج ہندوستان کی عورتوں کے حقوق کی شکل اختیار کر لی ہے اور شادی بیاہ کی مذموم اور قابلِ ملامت رسموں کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

میں تو سمجھتی ہوں کہ اگر حالیؔ نے مسدسؔ نہ بھی لکھا ہوتا تو "مناجاتِ بیوہ" ہی ان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ بحیثیت مجموعی مسدس کی عظمت اور اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن بعض لحاظ سے میری نظر میں مناجات کا درجہ مسدسؔ سے بھی زیادہ بلند ہے۔ ڈھائی سو اشعار کی اس نظم میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو شعر کی بلند کسوٹی پر پورا نہ اُترے یا جسے بھرتی کا کہا جا سکے۔ جو لفظ جہاں بٹھا دیا گیا ہے انگوٹھی کے نگینے کی طرح جڑ گیا ہے۔

حالیؔ کی ان نظموں کے سلسلے میں "کلمۃ الحق" کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ قوم یا فرد کے اخلاقی اقدار کو بلند کرنے کے لیے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حق اور صداقت کا احساس اور راست بیانی کی صفت پیدا کی جائے۔ اس دورِ زوال میں ہمارے دیس میں اس جنس کی جیسی ناقدری اور کمیابی اور جھوٹ کی جو گرم بازاری اور ارزانی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ایسے زمانے میں حق گوئی بہت بڑا جرم بن جاتی ہے اور اس کی بدولت جو کچھ سُننا اور جھیلنا پڑتا ہے اس کا مقابلہ کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔ اس نظم میں حالیؔ نے حق کی تلخی اور شیرینی دونوں کو بڑی خوب صورتی سے دکھایا ہے اور بتایا ہے

کہ ہمیشہ سے حق پرستوں نے اس کی خاطر مشکلیں اور مصیبتیں سہی ہیں مگر اس سے منہ نہیں موڑا ہے

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو؟ اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو؟
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
سقراط کو زہر تو نے دلایا شبّیر کو قتل تو نے کرایا
رخنے عرب میں تو نے نکالے بدر و اُحد میں رن تو نے ڈالے
موسیٰ کو مدین تو نے بھگایا احمدؐ سے مکّہ تو نے چھڑایا
تیرے جلو میں رسوائیاں ہیں سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں
دلدوز ہیں سب تیری ادائیں کڑوی ہیں تیری ساری دوائیں
دیتی ہے اوّل تو زخم کاری مرہم کی آخر آتی ہے باری
کل ہے مسرّت ہے آج غم تو دیتی ہے امرت کہتی ہے سم تو
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت تو جھوٹ واں پر کرتی ہے لعنت

یاں نام تیرا جس نے لیا ہے عالم کو اپنا دشمن کیا ہے
پہنچایا جس نے پیغام تیرا جمہور میں وہ بدنام ٹھیرا
کتنوں نے جانا ساحر نبیؐ کو کتنوں نے مانا کافر علیؓ کو
اے کلمۂ حق تیری بدولت مَردوں پہ گزری کیا کیا مصیبت
دنیا نے ان پر گو ظلم توڑا دامن انھوں نے تیرا نہ چھوڑا
ہے تلخ و شیریں ہر بات تیری سننے میں کڑوی کہنے میں میٹھی

لیکن اگر دنیا میں کلمۂ حق نہ ہوتا تو یہ ساری دنیا تیرہ و تاریک ہوتی۔

ہوتا نہ ہرگز جگ میں اُجالا — حق کا نہ ہوتا گر بول بالا
اے راست گوئی اے ابرِ رحمت — ہے اس چمن میں سب تیری برکت
تو بے کسوں کی یاور رہی ہے — تونگر ہوں کی رہبر رہی ہے
ہوتے رہے ہیں سب ملک و ملت — سرسبز تجھ سے نوبت بہ نوبت
گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے — پر تیری دارو صحت فزا ہے

ہر بول تیرا جوشِ غضب میں
ہے حق کی آواز راہِ طلب میں

حالی کلمۂ حق کا پرستار ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ہمیشہ وہ اس پر قائم رہے خواہ اس راہ میں کچھ ہی کیوں نہ جھیلنا پڑے ؎

اے کلمۂ حق اے سرِّ یزداں — جس وقت ہو تو پردے میں پنہاں
ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے — دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے

عالم ہو تیرا جب ناشناسا
حالی کو رکھیو اپنا شناسا

جدید طرز کی نظمیں کہنے کی تحریک حالی کو مغربی شاعری سے ملی، لیکن وہ کہیں یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ مغربی شاعری کا تتبع پوری طرح کر سکے ہیں یا اس میں اُنھوں نے کمال حاصل کیا۔ اُنھوں نے جدید طرز کی نظم گوئی کو اردو شاعری میں مروّج کیا مگر اس جدید میں قدیم کی بیشتر خصوصیات قائم رکھیں۔ اس میں بھی وہ نقّال نظر نہیں آتے بلکہ ان کی انفرادیت اور اجتہاد یہاں بھی جھلک اُٹھتا ہے۔ مجموعۂ نظمِ حالی کے دیباچے میں اپنے متعلق حالی نے لکھا ہے :—

" مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اُس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ اور نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی زبان میں جیسی اردو ہے ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغے اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس

نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عائد ۔۔۔۔۔"

حالی نے جدید طرز کی یہ نظمیں بہت سی کہیں۔ ان میں سے بعض اپنی شہرت، اثر اور حسن و خوبی میں لاجواب ہیں۔ بعض وقتی تحریکوں اور زمانے کے تقاضوں کے زیرِ اثر کہی گئی ہیں جن کا اثر زمانے کے ساتھ ساتھ دھیما پڑتا جاتا ہے۔ بعض میں فنی خوبیاں اور حُسنِ بیان کی لطافت، زبان کی شیرینی، معانی کی گہرائی اور اثر آفرینی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ بعض سپاٹ اور بے مزہ معلوم ہوتی ہیں لیکن قطع نظر حُسنِ بیان کے جہاں تک اپنے موضوع کو نباہنے کا اور اپنے خیالات کو خوبی اور وضاحت سے بیان کرنے کا سوال ہے، حالی ہمیشہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں اور اُن کی نظموں نے خاطر خواہ اثر دکھایا ہے۔ مسدّس حالی، بیوہ کی مناجات، حُبِّ وطن، برکھا رُت، کلمۂ حق اگرچہ زندۂ جاوید رہنے والی نظمیں ہیں لیکن اُس وقت اُن کی دوسری نظمیں بھی اُن سے کم درجے کی نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود حالی کو کبھی یہ غرّہ نہیں ہوا کہ میں بہت بڑا نظم نگار ہوں۔

مذکورہ بالا دیباچے میں حالی نے اپنی نظموں کو شائع کرنے کی "معذرت" کرتے ہوئے لکھا ہے :-

" اور ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں اعتراف کرتا ہوں کہ طرزِ جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ ابتدا میں میں نے اردو زبان میں ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چُننی اور اس کو ایک قصرِ رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گی ؎

پارۂ درخاکِ معنی تخمِ سعی افشاندہ ایم — بو کہ بعد از ما شود ایں تخم نخلِ باروار"

یہ حالی کا انکسار ہے کہ وہ اس نیو کو "ادھوری" اور "ناپائیدار" کہتے ہیں۔ زمانے

نے ثابت کر دیا کہ حالؔی نے جو نیو رکھی تھی وہ بڑی مکمّل اور پائیدار تھی۔ دراصل حالؔی کی اہمیت، اولیّت اور خصوصیت ان بنیادی پتھّروں ہی نے اردو ادب اور شاعری میں منوائی ہے۔ یہی بنا تھی جس پر آگے چل کر اردو نظم کی شاندار عمارت تعمیر ہوئی۔ جس کے لیے اردو شاعری اور اردو کے پرستار ہمیشہ حالؔی کے مشکور رہیں گے۔

رباعی

جیسا کہ ہمیں نظر آتا ہے حالؔی انیسؔ سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ اُنھوں نے بھی انیسؔ کی طرح رباعی میں ہر قسم کے اخلاقی مضامین ادا کیے ہیں اور اُسے سماجی اور معاشرتی اصلاح کا موضوع بھی بنایا ہے۔ انیسؔ کی رباعیوں کے بعد اردو شاعری میں حالؔی کی رباعیاں سب سے بلند درجے کی کہی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ اُنھوں نے بہت رباعیاں نہیں کہیں پھر بھی جو کہی ہیں وہ اپنی مستند حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ جس مضمون کو ادا کرنا چاہتے ہیں اِن چار مصرعوں میں بڑی روانی اور خوبی سے بیان کر دیتے ہیں۔ بعض بعض تو ایسے ہیں کہ دریا کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ہم یہاں ہر موضوع پر ان کی ایک ایک دو دو رباعیاں نمونے کے طور پر دیتے ہیں:

توحید

طوفاں میں ہے جب جہاز چکّر کھاتا   جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا   واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

نعت

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف   یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف

اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر	آبا کو بھی ہے تیری ابوّت سے شرف

زندہ دلی

خوش رہتے ہیں دُکھ میں کامرانوں کی طرح	ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل اُن کے ہیں، ظرف اُن کے، جو کرتے ہیں تیر	ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

اصولِ کار

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو	رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا	ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

علم

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے	سرچشمۂ نعما و ایادی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سایے میں ترے	دنیا کا وسیلہ دیں کا ہادی تو ہے

عیش و عشرت

اے عیش و طرب تونے جہاں راج کیا	سلطاں کو گدا، غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل	بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

عفو

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا	مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے	جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

تنزّل

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے	اسلام کا گِر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مَد ہے ہر جزر کے بعد	دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

پیری

اَب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم	پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال	آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

استغنا

دولت کی ہوس کا اصل گدائی ہے یہ	ساماں کی حرص، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہو تو ہے یہ شاہنشاہی	اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

حبِّ وطن

یارو نہیں وقت آرام کا یہ	موقع ہے اخیر فکرِ انجام کا یہ

بس حُبِّ وطن کا جپ چکے نام بہت   اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

صِلۂ خدمتِ قوم

کہہ دو جنھیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ   طعنے جھیلو ، بُرا سنو ، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صِلہ ہے سرِ دست   گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

شبِ ہجر

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے؟   اک خستہ جگر کی رات کیوں کر گزرے؟
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی   یہ چار پہر کی رات کیوں کر گزرے؟

مرثیہ ، قصیدہ ، نعت

حالؔی نے مرثیے اور قصیدے زیادہ نہیں کہے ، اردو مرثیے صرف تین کہے ہیں ۔ غالبؔ کا مرثیہ حکیم محمود خاں کا مرثیہ اور اپنے بھائی خواجہ امداد حسین کا مرثیہ ۔ فارسی میں سر سیدؔ کا مرثیہ اُن کا شاہکار کہا جا سکتا ہے ۔

غالبؔ کا مرثیہ ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا ۔ یہ مرثیہ اس محبت و عقیدت کا آئینہ ہے جو حالؔی کو غالبؔ سے تھی ۔ اور ساتھ ہی کمالِ شاعری کا نمونہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دِل کی کیفیت اور عقیدت شعروں میں ڈھل کر نکل آئی ہے ۔ ڈاکٹر عابد حسین کی رائے میں اس میں " غالبؔ کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی ۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصوّر انسانیّت کا تھا اس کی جھلک انھیں غالبؔ کی ذات میں نظر آئی اور اُسے انھوں نے شعر کا جامہ پہنا کر شہرتِ دوام بخشی ۔

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا   معنیِ لفظِ آدمیّت تھا

یہ شعر ایک قصیدے سے کم نہیں "

مرثیہ انیسؔ کا میدان ہے ، اور اس میں انھوں نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے ۔ اردو یا کسی اور زبان کا شاعر اس میدان میں ان کے پائے کو نہیں پہنچتا ۔ لیکن اُن کا موضوع سید الشہدا امام حسینؑ کی شہادت اور واقعاتِ کربلا کے دردناک اور عبرت آمیز مناظر ہیں اور

اُن کا میدانِ سخن مسدّس ہے۔ اگرچہ حالیؔ نے بھی قوم کا مرثیہ کہنے کے لیے بہترین صنف مسدّس ہی کو سمجھا مگر غالبؔ کے مرثیے کے لیے اُنھوں نے مثنوی کی وہ بحر اختیار کی جو سب سے زیادہ پُراثر اور دلنشین ہے۔ مرثیے کی اِس قسم میں حالیؔ کا کوئی مدِّ مقابل آج تک پیدا نہیں ہوا۔

بُلبُلِ ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نُکتہ داں، نُکتہ سنج، نُکتہ شناس — پاکِ دِل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج — رند اور مرجعِ کرام و ثقات
لاکھ مضمون اُس کا ایک ٹھٹول — سو تکلّف اور اُس کی سیدھی بات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھّا — قلم اُس کا تھا اور اُس کی دوات
اُس کے مرنے سے مر گئی دلّیؔ — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اُس کی بزم — یاں اگر ذات تھی تو اُس کی ذات

دل کو باتیں جب اُس کی یاد آئیں — کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل — کس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اُس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہلِ میّت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو — سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں
"اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح" — اہلِ انصاف غور فرمائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نُکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حُسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت

اُس کی تاویل سے بدلتی تھی — رنگِ ہجراں، وصال کی صورت
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے — انوریؔ و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے — غالبِؔ بے مثال کی صورت
شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بے گانہ اشک بار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع — رخصتِ موسمِ بہار ہے آج
تھی ہر ایک بات نیشتر جس کی — اُس کی چُپ سے جگر فگار ہے آج
غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد — کس سے خالی ہوا جہان آباد

شاعری کا کیا حق اُس نے ادا — پر کوئی اُس کا حق گزار نہ تھا
بے صلہ مدح، شعر بے تحسین — سخن اُس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذرِ سائل تھی جان تک لیکن — درخورِ ہمّت اقتدار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گِلہ — دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زُہد کے بدلے — زُہد اُس کا اگر شعار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیِ لفظِ آدمیت تھا

ہند میں نام پائے گا اب کون — سِکّہ اپنا جمائے گا اب کون
اس نے سب کو بُھلا دیا دل سے — اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے — جا کے دِلّی سے آئے گا اب کون
مر گیا قدردانِ فہمِ سخن — شعر ہم کو سنائے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالیؔ — غزل اس کی بنائے گا اب کون

یہ ایک حقیقت ہے کہ حالیؔ نے جہاں کہیں چھوٹی بحر استعمال کی ہے ان کے شعر بہت بلند ہو جاتے ہیں اور فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں مارنے لگتا ہے۔ اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کا جو مرثیہ اُنھوں نے کہا وہ لمبی بحر میں ہے، اور باوجود اس کے کہ شاعر کا دل اپنے محبوب اور محسن بھائی کی وفات پر خون ہو رہا ہے اُس میں شاعری کی وہ فنی خوبیاں پیدا نہیں ہو سکیں جو غالبؔ کے مرثیے میں ہیں۔ پھر بھی دَرد و اثر اس مرثیے میں بھی کم نہیں ہے

کل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھ کے چُپ چُپ
حالیؔ سے کہا ہم نے کہ اے بحرِ معانی
ہنسنا ہے، نہ رونا ہے، نہ بدلہ ہے نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی
دنیا ہے یہ اک دارِ فنا جس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی
ہو جائے گر انساں یونہی ہر رنج میں خاموش
کس طرح دِلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی
اک آہ بھری سُن کے یہ حالیؔ نے کہ جس سے
دِل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی
فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاصی و دانی
حالیؔ ہی کو معلوم ہے حالیؔ کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالیؔ کا سا بھائی
غم بھائی کا، مرجانے کی ہے دل کے نشانی
دل مردہ ہو حالیؔ کی طرح جس کا عزیزو
کیا ڈھونڈتے ہو اُس کی طبیعت میں روانی
یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ
یہ چپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی
بولیں گے بھی سو بار، ہنسیں گے بھی جہاں میں
یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لگانی
پر آہ کلی وہ کہ جو مُرجھا گئی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی

حکیم محمود خاں کا مرثیہ صرف اُن کا مرثیہ نہیں بلکہ دِلیؔ کی عظمت اور بزرگی، اُس کے علم اور حکمت کا مرثیہ ہے۔ شاعر دیکھ رہا ہے کہ ایک ایک کر کے صاحبانِ علم و حکمت رخصت ہو رہے ہیں۔ دلیؔ —— معدنِ جواہر دِلیؔ روز بروز تہی دست ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کی

چوٹ اُس کے دل پر پڑتی ہے ––

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہُنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہُنر وَر تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افادہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا
خاک سے اُٹھتے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اک جہاں شیوہ بیانی سے ہے اُن کی باخبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے کاشغر
حُسنِ صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد تھا
حسنِ معنیٰ تیرا حصّہ اے جہان آباد تھا
طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
اُن کے اُس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طبِّ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی
لیکن آخر طبعِ دوراں کا ہے جیسا اقتضا
ہر ترقّی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا
جبکہ دورہ اپنا تُو دنیا میں پورا کر چکا
وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا
گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار
تجھ پہ اے دارالخلافہ انقلاب آنے لگے
غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالعِ مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے
تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دارالعلوم اُٹھنے لگے علم و ہنر
چل دیے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
مٹ گئی تیری طبابت، چھٹ گئے تیرے طبیب

جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب　　اس گلستاں سے دا اُٹھی پھر صدائے عندلیب

جن کو کھو بیٹھے نظیر اُن کا کہیں پایا نہ پھر

جو گیا اُس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے　　واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے

کچھ سخنور تھے جو سحر اپنا دکھا کر چل دیے　　کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا

لے گئی سیلِ فنا اس کو بھی اے دِلّی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی　　ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی

پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی　　اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو

ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

اور آخر میں کس درد سے اپنی زندگی بھر کی مرثیہ خوانی کا نوحہ کرتے ہیں ؎

سُنتے ہیں حالیؔ سخن میں تھی بہت وسعت کبھی　　تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی

داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی　　اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں کہہ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ

گہہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم　　راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم　　کوئی بھی رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا

ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

ہم نے اپنی کم علمی اور کم مائگی کے پیشِ نظر اس کتاب میں حالیؔ کی فارسی شاعری

کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن مرثیے کے اس بیان میں بے اختیار جی چاہتا ہے کہ سرسیدؔ کے مرثیے کا تھوڑا سا ذکر کیا جائے جو فنِ شاعری کا ایک حسین نمونہ بھی ہے اور شاعر کے دِلی درد کا آئینہ بھی۔ سرسیدؔ کی لاثانی صفات اور ان احسانات اور خدمات کا مرقع بھی ہے جنھوں نے اُنھیں "سرسیدؔ" بنایا اور قوم کا دردناک مرثیہ بھی جو اپنے اس محسن کے بعد بے یار و مددگار سی نظر آ رہی تھی۔ غالبؔ کا اردو مرثیہ حالیؔ کا بڑا کارنامہ سہی مگر وہ ایک ذات کا نوحہ ہے جس کی صفات اور کمالِ شاعری نے حالیؔ کے دِل پر اثر ڈالا تھا۔ جوانی کی جذباتی محبت کی جھلک اُس میں صاف نظر آتی ہے۔ سرسیدؔ کا مرثیہ قوم کے ایک محسن اور صاحبِ علم و کمال انسان ہی کا نوحہ نہیں بلکہ ساری مسلمان قوم کا مرثیہ ہے۔ یہاں پختہ کار، دردمند، بالغ نظر شاعر اس ذات کے آئینے میں ساری قوم کی حالت دیکھتا، اور اُسے اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ جو ہر حساس دل کو بے چین کر سکتا ہے۔ سرسیدؔ سے شاعر کو جو بے پناہ محبت اور لازوال عقیدت ہے، اس کی بنا پر وہ اس مردِ مجاہد کی موت کو قوم کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے ؎

قوم را سرمایۂ مجد و عُلا از دست رفت　　بعد ازاں کاین گنج را در خاکداں انداختند

نو بہار آید دگر در باغِ قوم اُمید نیست　　بعد ازو طرحِ خزانِ جاوداں انداختند

اہلِ دیں بے یاور و دیں بےکس و بے یار ماند　　ہر گہ ایں آوازہ در ہندوستاں انداختند

سیدؔ اندر قوم نقدے بود اندر کیسہ　　کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند

رفت و با خود رونقِ بزمِ مسلماں بُرد　　ملت از مرگش بپژمردہ مسلمانی بمرد

تیسرے بند میں سرسیدؔ کی صفات اور ان کی اہم خصوصیات کس قدر دلکش انداز میں بیان کی ہیں ؎

میتواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن　　در فصاحت ہمچو سحباں در خرد لقماں شدن

میتواں قطبِ زماں شد، میتواں شد غوثِ وقت　　ہر چہ خواہی میتوانی شد بجز انساں شدن

چیست انسانی ؟ تپیدن از غمِ ہمسائیگاں ‏ ‏ ‏ ‏ از سمومِ نجد در باغِ عدن شرماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریِ ابنائے جنس ‏ ‏ ‏ ‏ در شبستاں تنگ دل از محنتِ زنداں شدن

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم ‏ ‏ ‏ ‏ گر توانی می توانی سیّد احمد خاں شدن
میتواں مقبولِ عالم گشت امّا ہمچو شیخ ‏ ‏ ‏ ‏ بہرِ سودِ خلق مردودِ جہاں نتواں شدن
جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن ‏ ‏ ‏ ‏ زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

ان اشعار سے جہاں سرسیّد کی سیرت اور صفات پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ سرسیّد کی یہی خصوصیت ہے جس نے حالؔی کا دل موہ لیا تھا اور چونکہ وہ خود ان صفات کے حامل اور دلدادہ تھے اسی لیے سرسیّد کی اتنی عقیدت ان کے دل میں تھی۔

لیکن حالؔی کسی وقت بھی ـــ اپنے مرشد کی وفات کے بعد بھی ـــ مایوس ہونے والے انسان نہ تھے۔ وہ صرف نوحہ خوانی پر اکتفا نہیں کرتے۔ روتے روتے جیسے ایک دم چونک پڑتے ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ وقت رونے کا نہیں، بلکہ نوحہ گروں کو سمجھانے کا ہے کہ اب ان کا کیا فرض ہے! جس وقت لوہا گرم ہو تو جو چوٹ ماری جائے کارگر ہوتی ہے۔ ساتویں بند میں قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

دوستاں! از مرگ نبود چارہ وز فرقت مفر
چوں زناں تا چند بودن، بہرِ سیّد نوحہ گر
جائے استقلال و وقتِ ہمّت و مردانگی ست
کایں بلائے ناگہاں رانیست جز ہمّت مفر

سیّد کی موت بڑی مصیبت ہے لیکن اس سے کہیں بڑی مصیبت یہ ہو سکتی ہے کہ قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کی فلاح و ترقی کی کوششیں، سیّد کے بعد ختم ہو جائیں ؎

در غمِ سیّد اگر از فرضِ خود غافل شدید
ایں مصیبت راست صد چندیں مصیبت بر اثر

سیّد نے جو راستہ دکھایا ہے جو دار العلم قائم کیا ہے، قوم کا فرض ہے کہ اس کی اعانت کرے، اس سے فیض اٹھائے اور اسے قائم رکھے ؎

خواجہ دار العلمے از بہرِ شما بگذاشت است
تا بود نسلِ شما از علم و دولت بہرہ ور
کوہ را کنداست تا ایں جوئے شیر آوردہ است
آب رفتہ بود و در جوئے شما آید ز سر
یادگارِ خواجہ بعد از خواجہ برپا داشتن
شکر اورا خوب تر زیں نیست اسلوبے دگر
مژدہ او، ایں بس کہ در اصلاحِ خود کوشید زود
کز شما غیر از شما مطلوبِ او چیزے نہ بود

قصیدے حالؔی نے بہت کم کہے ہیں۔ تمام اصنافِ سخن میں سب سے کم دلچسپی انھیں اسی صنف سے معلوم ہوتی ہے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "مدحیہ قصیدے کا جس میں جھوٹ اور مبالغہ ہو لکھنا میرے لیے سخت مصیبت ہے۔" انھوں نے جو چند قصیدے کہے ہیں اُن میں سے کئی ناتمام چھوڑ دیے ہیں اور اُس میں بھی اپنے ممدوح کی تعریف میں مبالغے اور اُس کی طرف ناممکن صفات کو منسوب کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ وہ حتی الامکان صرف ان خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں جو اُس میں واقعتاً موجود تھیں یا اُن اچھے کاموں کا بیان کرتے ہیں جو اُس نے کیے ہیں۔ حالؔی کے قصائد کے بارے میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ ان کے قصائد میں "برخلاف طریقۂ سابق کے مادح کی ساری قابلیّت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح کو اپنے اہم فرائض اور ذمّے داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اُسے سُنائی جاتی ہیں۔" یہ صفت حالؔی نے اپنے رُوحانی گرو سعدؔی سے سیکھی تھی۔ سر آسماں جاہ بہادر کی شان میں جن کی حالؔی دل سے عزّت کرتے تھے اور اُن کا بڑا احسان

مانتے تھے اُنھوں نے دو تین قصیدے لکھے ہیں جن میں دو نا تمام ہیں۔ ان میں بھی ممدوح کی حقیقی صفات کے بیان سے آگے نہیں بڑھے اور انھیں ان کاموں کی طرف توجہ دلانے سے گریز نہیں کیا جو انھیں کرنے چاہییں ؎

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی ان کی — جنھوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا
جنھوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما — جنھوں نے علم کا بجھتا چراغ اٹھایا
سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار — لیا سنبھال اسے جس نے ہاتھ پکڑایا
نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھ کر — انھوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا
نشاطِ عشرتِ جاوید کی ہے ان کو نوید — دل ایسا جن کو عنایت خدا نے فرمایا
سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف — سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا

حالؔی نے دو نعتیہ قصیدے لکھے ہیں جن میں قصیدے کا زورِ بیان اور اس کی روایتی شان زیادہ جھلکتی ہے۔ آن حضرتؐ کی شان میں شعر لکھتے وقت ان کی زبان میں بلندی، اور شان و عظمت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی عام سادگی اور سلاست سے مختلف ہے ؎

گھر اس کا مورِدِ قرآن و مہبطِ جبریلؑ — در اس کا کعبۂ مقصود انس و جاں کے لیے
سپہر گرمِ طواف اس کی بارگاہ کے گرد — زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لیے
وہ گونہ گونہ مدارا وہ بات بات میں مہر — کشائشِ گرہِ کیں وہ دشمناں کے لیے
گر افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے — گر انکسار مدارات میہماں کے لیے
کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے — کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لیے
صفائے قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ — دعائے خیر بد اندیش و بد گماں کے لیے
شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے — بشارت امّتِ عاصی و ناتواں کے لیے
حریفِ نعتِ پیمبر نہیں سخنِ حالؔی — کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لیے

ایک دوسرے نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں کچھ شعر فخریہ لکھے ہیں ؎

میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور — مجھ سے اٹھیں گے اُن کے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ — مجھ سے برتر ہے میری طبعِ غیور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں — اس سے شکوہ نہیں کہ ہے مجبور
پہلے ہو گی کسی کو قدرِ سخن — اٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور
سخنِ حق کی داد لوں کس سے — سن چکا ہوں فسانۂ منصور
دُرِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب — ماہِ کامل ہوں اور ہوں بے نور

اور پھر اس کے بعد ؎

لوں ملائک سے دادِ حسنِ کلام — گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور
وہ شہنشاہ، امتی جس کا — یاں گنہگار اور واں مغفور
لبِ شیریں کلام سے اس کے — دوست بھی شاد، غیر بھی مسرور
ہو سکے اس کی خوبیوں کا شمار — نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
اے ترا پایہ فہم سے برتر — اے ترا نام عرش پر مسطور
میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں — نام تیرا شفیعِ روزِ نشور
دُہائی ہے آستانِ والا سے — ہے بہت تنگ حالیِ مہجور
جا لگے تیرے در پہ کشتیِ عمر — جب کروں بحرِ زندگی سے عبور
جیتے جی دل میں یاد ہو تیری — مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

حالؔی کے قصیدوں میں ہمیں وہ زور اور حسنِ بیان اور فنی کمال نہیں ملتا جو اُن کی دوسری قسم کی نظموں میں ہے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس صنفِ کلام سے انھیں مناسبت ہی نہ تھی۔ یہاں تک کہ نعتیہ قصیدوں میں بھی وہ بات پیدا نہ ہو سکی لیکن ان کا دوسرے طرز کا نعتیہ کلام (جس میں مسدس کے چند بند اور رباعیاں اور ان کی ایک مشہور نظم 'عرضِ حال' شامل ہے)، بہت زیادہ پُر جوش اور فنِ شاعری

کی خوبیوں سے مزین ہے۔

نعتیہ قصیدوں کے علاوہ حالؔی کی ایک دعا "عرضِ حال" بہت مشہور ہے۔ اس میں شاعر رحمۃ اللعٰلمین محمد مصطفےٰؐ سے فریاد کرتا ہے کہ اے رسول اللہ اپنی امت کا حال دیکھیے جو پہلے تمام جہاں میں سب سے زیادہ باعزت اور سرخرو، باعمل اور باہمت قوم تھی وہ آج کس پستی اور ذلت کی حالت میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہر ہر شعر شاعر کا دل چیر کر نکلا ہے ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

جس دین نے غیروں کے تھے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عرصۂ تیغِ جہلا و سفہا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دیں داروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

ہے دین کی دولت سے بہا، علم سے رونق
بے دولت و علم اس میں نہ رونق نہ بہا ہے

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بِنا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اس کے ہوا ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے

بگڑی ہے اب ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ قضا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے سے نہ قسمت سے گلہ ہے

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے

فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

اے چشمۂ رحمت بِاَبِی اَنتَ وَ اُمّی
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

کر حق سے دعا اُمتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے گھرا ہے

امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی وِلا ہے

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ ایک ایک فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
امت تری ہر حال میں راضی برضا ہے

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

ہاں حالؔیِ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلہ ہے

ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگِ خطا ہے

حالی کی شاعری کی خصوصیات

حالی کے زمانے تک ادب وشاعری کا کام دماغی تفریح اور ذہنی مشغولیت تک محدود تھا۔ اور اکثر فن کار" فن برائے فن" کے بے جان اور فرسودہ نظریے کے پجاری تھے۔ سب سے پہلے حالی نے اسے محسوس کیا کہ یہ نظریہ صرف ناقص ہی نہیں غلط بھی ہے۔ شعر و ادب زندگی سے بالکل بے تعلق ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ اس کی کچھ نہ کچھ ترجمانی ضرور کرتے ہیں خواہ وہ ارادی طور پر نہ ہو۔ جو شاعر فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اپنا مشاہدہ محض داخلی زندگی تک محدود رکھتے ہیں وہ بھی حقیقت میں اپنی اور اپنے زمانے کی حالت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اجتماعی زندگی کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہ تھی اور ہر ایک اپنی اپنی ذات میں مگن زمانے کی مصیبتوں کو من کی ایک دنیا بسا کر بھلانا چاہتا تھا۔ حالی نے شعر و ادب سے حقیقی زندگی کی ترجمانی کا کام لینے کے ساتھ ساتھ اسے اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ "مقدمۂ شعر و شاعری" لکھنے کی غرض یہی تھی کہ وہ شاعروں کو یہ سمجھائیں کہ شعر کا اصلی مقام کیا ہے اور شاعر اس سے کیا کچھ کام لے سکتا ہے۔ آج سے ساٹھ پینسٹھ برس پہلے جب لفظوں کی طلسم سازی اور خیال کی بلند پروازی اور قیاسی دنیائیں بسانا شاعری کا کمال سمجھا جاتا تھا، حالی کی زبان سے یہ انقلاب آفریں صدا بلند ہوئی تھی ۔

اے شعرِ دل فریب نہ ہو تو، تو غم نہیں — پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو

حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو — آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو

اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز — جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو

جو نابلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ — گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا — محمود جان آپ کو، گر ہے ایاز تو

اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

ادب و شاعری کی جو نئی راہیں آج ہمارے سامنے کھلی ہیں یہ حالی ہی کی کھولی ہوئی ہیں۔ ترقی پسند شاعری کا پودا جس کے اب پھلنے پھولنے کے دن آئے ہیں حالی ہی کا لگایا ہوا ہے۔ ہاں اس وقت ترقی پسندی کا تقاضہ یہ تھا ۔

چپ چاپ اپنی سچ سے کیے جا دلوں میں گھر — اونچا نہ کر ابھی علمِ امتیاز تو

مگر اسی کے ساتھ یہ عزم بھی کہ اگر ساری دنیا مخالفت پر آمادہ ہو جائے تب بھی حقیقت نگاری کی سیدھی راہ سے قدم نہ ہٹے ۔

اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

اور یہ احساس بھی کہ نئی دنیا کی فتح کا طریقہ یہ ہے کہ ۔

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

یہ حقیقت بھی حالی سے چھپی ہوئی نہ تھی ۔

ہوتی ہے سچ کی قدر، پہ بے قدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

اور وہ کتنے ہی منکسر مزاج ہوں پر اس بات کو جانتے تھے کہ آج شعر کا اصلی مقام سمجھنے والا ان کے سوا دوسرا نہیں ۔

جو قدرداں ہو اپنا اسے مُغتنم سمجھ　　حالیؔ کو تجھ پہ ناز ہے کہ اس پہ ناز تو

حالیؔ سادگی کا دلدادہ اور حقیقت نگار شاعر ہے اس لیے کہ اس کا مقصد اپنا پیام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ہے۔ اور جس شاعر کا یہ مقصد ہوگا اس کو سادہ اور عام فہم زبان میں کہنا ضروری ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شاعر زندگی کی حقیقی تصویر کھینچنے کا حوصلہ کرے گا اس کے لیے اصلیت اور حقیقت نگاری لازمی چیزیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کے اشعار میں درد و اثر اور حسن آفرینی بھی ناگزیر ہے۔

حالیؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیات اس کی سادگی، اصلیت، جوش، حقیقت پسندی اور درد و اثر ہیں۔ انھیں تخیل کی انتہائی بلند پروازی، پیچیدہ استعاروں اور دور از کار تشبیہوں، الجھے ہوئے خیالات، رنگین بیانی اور طلسمی دنیائیں بنانے سے دلچسپی نہیں۔ وہ ان سے کام لینے ہیں نہ لینا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ؎

کیجیے کیا، کیجیے نہ حالیؔ سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

تو انکسار ہے۔ اس لیے کہ بندھی ٹکی ڈگر پر چلنا اور دوسرے رنگین نواؤں کا تتبع کرنا مشکل نہیں، مشکل ہے نیا راستہ نکالنا اور نئی طرزیں ایجاد کرنا یا پھر حالیؔ نے لطیف انداز میں اپنے سادہ اور پُر اثر اندازِ بیان کو سراہا اور مہمل گو رنگیں نواؤں پر ہلکا سا طنز کیا ہے۔

لیکن اندازِ بیان کی سادگی کے باوجود ان کے ہاں، درد و اثر کی کمی نہیں۔ مثلاً اس شعر کو دیکھیے ؎

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

کتنا سادہ اور حقیقت سے بھرپور مضمون ہے مگر کتنا اثر ہے اس شعر میں!

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبّت ہے کہ دل میں موجزن ہے

محبت کی کیسی پر اثر اور سچی تفسیر ہے!

یا یہ شعر پڑھیے :—

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　　وقت پہنچا مری رسوائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں　　گُل و بلبل کی شناسائی کا

یا ؎

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا　　وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

اس قسم کے سینکڑوں اشعار حالیؔ کے ہاں ملتے ہیں جن میں سادگی، اصلیت اور درد و اثر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر فن کار اپنے فن سے لوگوں کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ شاعر کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرے۔ البتہ اس کی نوعیت میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ اکثر پرانے شاعر لوگوں پر حیرت و استعجاب کا اثر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس وقت شعر کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو مسحور کر دے۔ وہ حیران ہو کر کہیں" واہ کیا خوب کہا ہے" یعنی حاصلِ کلام زیادہ تعریف کرانا ہوتا تھا۔ لیکن حالیؔ سامع کو مسحور کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے شعر کا مقصد تعریف و تحسین حاصل کرنا نہیں بلکہ دل اور دماغ کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ وہ اسے دلفریب نہیں دلگداز بنانے کے قائل ہیں ؎

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

وہ یہ نہیں چاہتے کہ شعر کو سنتے ہی لوگ بے اختیار واہ واہ پکار اٹھیں اور کہیں" بھئی خوب کہا ہے —" وہ چاہتے ہیں کہ شعر، شعر سننے والے کے دل میں جا کر بیٹھ جائے۔ لوگ اسے سمجھیں اور محسوس کریں کہ کتنا ٹھیک کہا ہے۔ کیسی سچّی بات بیان کی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے شعر سے خطاب کرکے کہتے ہیں ؎

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

یہی ”دلگدازی“ اور ”سادگی“ حالؔی کے شعروں کی جان ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالؔی کے کلام میں دلگدازی، دل سوزی، اور سادگی کے ساتھ ساتھ ”دلفریبی“ نہ سہی دلنوازی اور دلکشی ضرور ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں، اہلِ دل کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ حالؔی نے جو کہا خود دل سے کہا۔

ان کا جذبہ صرف گلے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں ہوتی ہیں اور اسی لیے وہ اتنا پراثر اور دلگداز ہوتا ہے۔ رام بابو سکسینہ حالؔی کے کلام کی خصوصیات کا خلاصہ یوں کرتے ہیں ”نیچر کی پیروی، مبالغہ اور اغراق سے احتراز، سادگی اور صفائی، جذبات درد واثر۔“

پرانے طرز کے نقّاد ہی نہیں نئے تنقید نگار بھی ان سے کچھ کم متاثر نہیں آل احمد سرور کا خیال ہے کہ ”حالؔی اپنے باغ کو پھولوں سے نہیں سجاتے بلکہ ان کے ہاں وہ رنگینی ہے جو خونِ جگر سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کا طرز رواں، متین اور سنجیدہ ہے۔۔۔۔۔۔ اُن کے ہاں بھی خامیاں ہیں، ان کا اخلاقی نقطۂ نظر کہیں کہیں اس قدر نمایاں ہے کہ شاعری گھبرا کر پناہ مانگنے لگتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ان میں وہ والہانہ کیفیت، وہ خود سپردگی نہیں جو شاعری کی جان ہے۔ وہ تحیّر نہیں جو غالؔب یا سوؔدا یا اقبؔال یا انشؔا تک میں موجود ہے — مگر ان کے ہاں حیرت انگیز توازن، حیرت انگیز گہرائی اور حیرت انگیز اثر موجود ہے۔ وہ جدید شاعری کے پیغمبر اور اردو کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔۔۔۔“

اخلاقی اقدار کا یہ پرستار شاعر، جس کے ”اخلاقی نقطۂ نظر۔۔۔۔“ پر نئے دور کے ترقی پسند نقّاد کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں، اپنے عظیم مقصد اور اپنے فن کی خوبیوں دونوں لیے ان سے خراجِ تحسین اور عقیدت وصول کر لیتا ہے۔ سردار جعفری ”ترقی پسند ادب“ میں لکھتے ہیں: —

”حالؔی کا مسدس اردو زبان کی پہلی نظم ہے جسے ہم عظیم کہہ سکتے ہیں۔ یہ حالؔی کا شاہکار تھا اور اس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا۔ باوجود اس کے کہ اس کا

خطاب مسلمانوں تک محدود ہے (اور یہی اس کی خامی ہے)، اس میں ہندوستان کی فضا ہے۔ اس میں حالؔی نے بے پناہ خلوص سے ہندوستان کے جاگیرداری انحطاط کی تصویر کھینچی ہے۔ حالؔی ”اسلامی تہذیب و تمدّن“ کا انحطاط اور مسلمان ”شریف گھرانوں“ کی پستی بیان کر رہے تھے لیکن اس کی تصویر انھوں نے اتنے خلوص اور شاعرانہ دردمندی سے کھینچی کہ وہ جاگیرداری عہد کے زوال کی بڑی مکمّل تصویر بن گئی۔ مسدس کی عظمت کا یہی راز تھا۔ فنّی اعتبار سے مسدس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو آج بھی ترقی پسند شاعری کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ زبان کی سادگی، نرمی، سلاست، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں سے پرہیز، براہِ راست اندازِ بیان ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے جاگیرداری اندازِ بیان کے تصنع کو ختم کر دیا۔“

مکتوباتِ احتشام، عبادت، وقار عظیم اور دوسرے ترقی پسند نقّادوں نے بھی حالؔی کے فن کی عظمت اور خوبی کو اکثر سراہا ہے۔ ہم طوالت کے خوف سے ان کی رایوں کا اقتباس پیش نہیں کرتے۔

مختصر یہ کہ حالؔی کا کلام قوم کے نام ایک حیات بخش پیام تھا جو اسے پہنچا اور اس نے حسبِ استعداد اسے قبول کیا۔ اب وہ اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب کی ایک عزیز دولت ہے جس سے اہلِ نظر اور اہلِ دل صدیوں استفادہ کرتے رہیں گے۔

حالؔی کی نثر

رومانی شاعر جن کا میدان محض حسن و عشق کا طلسم باندھنا ہوتا ہے بالعموم اچھے نثر نگار نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ نثر تخیّل کی اس رفعت، بیان کی اس رنگینی اور جذبات کی اس شدّت کی متحمّل نہیں ہوسکتی جس کا اظہار شعر میں بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس قسم کی نثر لکھی ضرور ہے مگر وہ ایک مصنوعی سی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن حالؔی جیسا شاعر جس کی شاعری میں بھی زبان و بیان کی سادگی، وضاحت اور حقیقت پسندی کمال کو پہنچی ہوئی ہے، نثر نگار بھی اتنا ہی کامیاب ہوسکتا ہے جتنا شاعر۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حالؔی نے نثر کے میدان میں بھی ایک بیش بہا ادبی ورثہ چھوڑا ہے اور نثر نگاری میں ان کی شہرت شاعری سے کم نہیں۔

حالؔی سے پہلے اردو نثر کا موضوع بہت محدود تھا۔ اس میں یا تو قصے اور داستانیں لکھی جاتی تھیں یا مذہبی کتابیں۔ حالؔی نے بھی ابتدائی زمانے میں جو کتابیں نثر میں لکھیں وہ مذہبی ہیں یا نیم مذہبی۔ تریاقِ مسموم، مولود شریف وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ علمی خیالات کو اردو زبان میں ادا کرنے کی اس وقت تک کوئی قابلِ ذکر کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جب علمی خیالات بیان کرنے کی ضرورت ہوتی تو اس کے لیے فارسی کو جو اردو کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ زبان تھی، اختیار کیا جاتا تھا۔

سب سے پہلے سرسیّد نے زمانے کے بدلتے رنگ کو پہچانا، جہاں انھوں نے قوم کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا وہاں ان کی دور بین نظر نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اب ہندوستان میں فارسی زبان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس کے بجائے اردو کو فروغ دے کر اس قابل بنانا چاہیے کہ اس میں علمی خیالات آسانی سے ادا ہوسکیں۔ رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کرنے میں جہاں اور اصلاحی مقاصد پیشِ نظر تھے وہاں اردو زبان کو وسعت دینے اور اسے زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور علمی ادبی مضامین ادا کرنے کے قابل بنانے کی سعی بھی شامل تھی۔ اس رسالے میں خود سرسیّد اور ان کے ہم خیال ساتھی ہر قسم کے سنجیدہ مسائل پر مضامین لکھ کر اردو زبان کی توسیع اور اردو ادب کو مالامال کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اردو نثر نگاری کو نئی راہ پر ڈالنے کا فخر سرسیّد کے حصے میں آیا اور اس تحریک کو بڑھانے اور تکمیل تک پہنچانے میں جن لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ان میں حالؔی اور شبلؔی کا حصّہ سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہے۔

حالؔی نے نثر نگاری کے میدان میں اپنے لیے دو خاص موضوع منتخب کیے تھے۔ ادبی تنقید اور سیرت نگاری۔ ان دونوں میں ان کی نظر مؤرّخ کی نہیں بلکہ نقّاد کی نظر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل مناسب معلوم ہوتی ہے۔

علمی اور ادبی مسائل اور اشخاص کی سیرت پر دو طرح سے نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ ایک تاریخی دوسرے تنقیدی اور اصولی۔ تاریخی اندازِ فکر تو یہ ہوتا ہے کہ جب کسی فرد یا کسی فن پر بحث کرے تو اس کی ابتدا اور نشو و نما پر تفصیل سے روشنی ڈالے۔ اصولی اندازِ فکر یہ ہے کہ مصنّف اشخاص پر یا ادب و شاعری وغیرہ پر اس نقطۂ نظر سے غور کرے کہ ان کا اصلی مقصد کیا ہے اور وہ اس مقصد کو کس حد تک پورا کرتے ہیں۔ سماج اور ماحول کا ان پر کیا اثر پڑا اور انھوں نے اپنے سماج اور ماحول پر کیا اثر ڈالا؟

حالؔی کا اندازِ فکر چونکہ اصولی اور تنقیدی ہے اس لیے انھوں نے دوسرا اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ وہ شعری تاریخی نشو و نما یا اشخاص کی سیرت کے ارتقا پر زیادہ زور نہیں دیتے بلکہ

دونوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کا اپنے ماحول سے کیا تعلق تھا، انھوں نے ایک دوسرے کو کس حد تک متاثر کیا اور ان کے پیشِ نظر جو مقصد تھا اسے وہ پورا کرتے ہیں یا نہیں؟

مؤرخ کے اسلوبِ بیان میں ادبی شگفتگی، دل آویزی اور روانی کی گنجائش زیادہ ہے۔ اس میں متانت اور وضاحت بھی ہوتی ہے لیکن ادبی رنگ غالب رہتا ہے جو عام طور پر پسندیدہ اور مقبول ہوتا ہے۔ اسی لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حالیؔ کی علمی تصانیف اتنی زیادہ مقبولِ عام نہ ہوئیں جتنی بعض دوسرے ادیبوں مثلاً شبلیؔ کی۔ حالیؔ کے اور دوسرے انشا پردازوں کے اندازِ بیان میں بھی نمایاں فرق ہے۔ اگر وہاں ادبی چاشنی، شگفتگی اور رنگینی ہے تو حالیؔ کے ہاں صحت، وضاحتِ خیال، متانتِ بیان اور روانی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو ادبی اندازِ بیان زیادہ دلچسپ اور حالیؔ کی تحریر خشک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے مطالعے کا مقصد محض دماغی تفریح یا وقت گذاری ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے جو لوگ محض اس غرض سے کتابیں پڑھتے ہیں وہ شگفتہ اور رنگین طرزِ بیان ہی کو پسند کریں گے۔ لیکن اگر مطالعے کا مقصد محض دماغی تفریح نہیں بلکہ کسی علمی مسئلے کا حل کرنا، کسی ذہنی الجھن کو دور کرنا کسی مسئلے کی حقیقت کو سمجھنا ہے تو اس وقت حالیؔ کی تحریر کی صحیح قدر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے پڑھنے والے کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو دماغی تفریح سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یعنی علمی ذوق کی تسکین اور تلاش میں کامیابی۔

حالیؔ کی نثر میں وضاحت، متانت، استدلال، اعتدال اور توازن سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں سلاست اور روانی بھی پائی جاتی ہے لیکن اس کی شان دوسری ہے وہ روانی نہیں جو زبان تک محدود رہتی ہے۔ یعنی پڑھتے ہوئے زبان کہیں نہ اٹکے، چٹخارے لیتی ہوئی چلی جائے بلکہ ان کے ہاں وہ معنوی روانی ہے جس میں دماغ کہیں نہیں بھٹکتا، ذہن ٹھوکر نہیں کھاتا علمی مسائل ذہن میں صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالیؔ کا مقصد الفاظ سے کھیلنا اور ان کی مدد سے ایک طلسمی دنیا بنا کر محض ذہن کو لبھانا اور مسحور کرنا نہیں۔ وہ پڑھنے والوں کو لوری دے کر سلانا نہیں چاہتے بلکہ ان کے دل اور دماغ کی آنکھیں کھول کر ان کو

سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ ان نتائج کو جو وہ پیش کرتے ہیں، ان کا ذہن سوچ سمجھ کر قبول کرے۔ اپنے اس دعوے کی تصدیق میں حالیؔ کی نثر کے بارے میں بعض مشہور ادیبوں اور نقّادوں کی رائے پیش کروں گی۔

پروفیسر گراہم بیلی (جنھوں نے اردو زبان کے مطالعے اور خدمت میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا ہے) حالیؔ کی تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں " حالیؔ کی طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان مصنوعی آرائش اور تصنع سے مبرّا ہے۔ وہ کسی قدر پھیکا اور ناہموار ضرور ہے لیکن زور اور صحت سے معمور ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ سائنٹفک موضوعات پر قلم فرسائی کرتے ہیں۔۔۔۔"

شیخ چاند مرحوم نے حالیؔ کی نثر کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس پر ایک مفصل اور جامع مضمون لکھا تھا، کہتے ہیں:

"حالیؔ کی نثر کا انداز نہایت جچا تلا اور سنجیدہ و متین ہے۔ وہ خیال کے اعتبار سے زبان و بیان اختیار کرتے ہیں اور مؤثر و دل نشین انداز میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کو سمجھنے میں سامع یا قاری کو کبھی دشواری پیش نہیں آتی اور وہ بے تکان مصنّف کی پروازِ خیال کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ لفظی صنّاع اپنے قاری کو دھوکا دیتا ہے اور اپنے خیالات کی الجھن چھپا کر نمائشی اور ظاہری تماشے دکھاتا ہے لیکن حالیؔ اپنے پڑھنے والے کو وہ جلوے بے نقاب کر کے دکھاتے ہیں جن کو خود مصنّف کے تخیّل کی آنکھ دیکھتی ہے۔ وہ لفاظی اور بیجا تصنع کا کبھی شکار نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کو اپنے خیالات کا تابع کر لیتے ہیں اور ان کی اس طرح کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ کرتے ہیں کہ خیال کے جسم پر ٹھیک اترتے ہیں۔۔۔۔۔ اس سلاست اور سادگی میں بھی انشا و بیان کی خوبیاں زائل ہونے نہیں پائیں بلکہ زورِ بیان اور فصاحتِ زبان کا رنگ زیادہ نمایاں اور جاذب ہوتا ہے۔ حالیؔ خیال کو صفائی اور صحت کے ساتھ بیان کرنا انشا پردازی کا ہنر سمجھتے ہیں۔ علمی اور ادبی خیالات کی صحت اور باریکی شاعرانہ صنّاعی کو قبول نہیں کرتی۔ اس کا قدم آیا اور علمی مسائل کی نزاکت فنا ہوگئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالیؔ کی طرزِ تحریر ادیبانہ اور انشا پردازانہ ہی نہیں بلکہ علمی اور خالص تنقیدی

بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالی کی نثر کی ایک اور خصوصیت استدلال ہے ۔ وہ اپنے خیالات کو نہایت مدلل طور پر پیش کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی تمثیلیں اس قدر دلچسپ اور برمحل ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا خیال کو بے تامل قبول کر لیتا ہے اور تمثیل کے نازک اور لطیف استعمال سے حظ اٹھاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہی نہیں کہ سنجیدہ ادیب و نقاد حالی کی نثر کے مداح ہیں بلکہ بعض رنگین مزاج، شوخ طبع اور صنعت کے دلدادہ حضرات بھی ان کی نثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔ مہدی افادی جیسا رنگین طرزِ ادا کا مالک اور سخت نقاد، جو ہر قسم کی "خشک" چیزوں کے خلاف بے پناہ اور مبالغہ آمیز تنقید کرنے کا عادی تھا یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "سر سید کے بعد اگر کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں"

حالی کی نثر کی خوبیوں کا اعتراف ڈاکٹر عابد حسین نے یوں کیا ہے "حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں ۔ اس میں پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست و روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کیے جائیں ۔ پھر بھی ان کا اسلوبِ بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں ۔ اور لطف یہ کہ علمی متانت اور وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا ۔ ۔ ۔ ۔"

حالی صاحبِ طرز ادیب تھے ۔ بقول آل احمد سرور کے "ان کے جتنے رفیق اور ہم عصر تھے سب صاحبِ طرز تھے لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی ۔ باقی یا تو ختم ہو گئے یا ان کی کار فرمائی محدود ہو گئی ۔ آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زورِ بیان، سر سید کی سادگی، شبلی کی رنگینی سب اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آج نثر کا کیا رجحان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور یہ حقیقت ہے کہ حالی کا طرز ہی زندہ و پائندہ طرز تھا جسے اردو کے ادیب اپنا سکتے تھے اور ایسے ہی طرز کو حیاتِ جاوید نصیب ہوتی ہے ۔

حالی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں وہ ہزاروں متروک الفاظ بھی موجود ہیں جنھیں عام طور پر ادیب و شاعر عامیانہ اور گھٹیا سمجھ کر ناقابلِ اعتنا سمجھتے تھے، لیکن حالی نے ان کا ایسا برمحل اور موزوں استعمال کیا ہے اور انھیں اس

خوبی کے ساتھ بٹھایا ہے جیسے نگینے جڑ دیے گئے ہوں ۔ ان کی بدولت ان لفظوں نے ادب میں اپنی جگہ بنا لی ۔ حالی کا ادبی مشرب بہت وسیع تھا ۔ وہ اردو کے خزانے کو بڑھانا چاہتے تھے اور اس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ اردو زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ ہزاروں کی تعداد میں شامل ہیں، جو سب آپس میں مل جل کر اس کا جزو بدن ہو گئے ۔ چنانچہ انھوں نے ہندی کے اور دوسری دیسی زبانوں کے الفاظ بے تکلف استعمال کیے ہیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ "انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کسی اردو کے ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا ۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے ۔ ۔ ۔ ۔"

حالی ہندی کے نرم، شیریں اور خوب صورت الفاظ سے بخوبی واقف تھے ۔ اس لیے وہ انھیں بڑی خوبی اور صحت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے فطری مناسبت ہے ۔ دونوں ایک ماں کی گود میں پرورش پائی ہوئی بہنیں ہیں ۔ لکھنے والا اگر دونوں سے واقف ہو تو ایک کے لفظ دوسری میں بڑی خوبی سے کھپا سکتا ہے ۔ چنانچہ حالی نے ایسا ہی کیا ۔ حالی نے اپنی تحریر میں انگریزی لفظ بھی کافی تعداد میں استعمال کیے ہیں لیکن انگریزی زبان سے اوّل تو وہ اچھی واقف نہ تھے، دوسرے انگریزی ایک بدیسی اور اجنبی زبان تھی، جس سے اردو کا وہ قریبی رشتہ نہیں ہو سکتا تھا جو ہندی سے ہے، اس لیے انھوں نے انگریزی کے جو لفظ اپنی نثر میں جا بجا استعمال کیے ہیں وہ اکثر کھٹکتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے ستر اسّی سال میں ہوتے ہوتے انگریزی کے بھی سینکڑوں لفظ اردو میں اس طرح کھپ گئے ہیں کہ اب نکالے نہیں نکل سکتے لیکن حالی کے ہاں بعض ایسے غیر ضروری اور نامانوس الفاظ بھی ملتے ہیں جو کسی طرح اردو میں نہیں کھپتے ۔ شاید حالی کا یہ خیال تھا کہ جس طرح اردو، ہندی، فارسی، عربی اور ترکی وغیرہ کے ہزاروں لفظوں سے مالامال ہے، اسی طرح انگریزی سے بھی بہت کچھ

لے گی۔ حالیؔ کا یہ خیال اس حد تک تو ضرور پورا ہوا کہ خیالات میں اردو نے انگریزی سے بہت کچھ استفادہ کیا لیکن زبان میں صرف انھیں لفظوں کی کھپت ہو سکی جو یا تو چل چھلا کر اردو بن گئے ہیں یا بدیسی چیزوں کے نام اور ان کے متعلقات ہیں جو انگریزی حکومت کے ساتھ ملک میں آئیں۔ یا بعض اصطلاحیں ہیں جو ہمارے ہاں پہلے سے رائج نہ تھیں۔ اس سے زیادہ اردو زبان انگریزی زبان سے نہ لے سکتی تھی اور نہ اس نے لیا۔

حالیؔ نے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کی چار کتابیں بہت زیادہ مشہور اور مقبول ہوئی ہیں۔ حیاتِ سعدیؔ، یادگارِ غالبؔ، حیاتِ جاوید اور مقدمۂ شعر و شاعری۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب "مجالس النساء" بھی اپنے زمانے میں بہت مقبول تھی۔ اس میں عورتوں کی اصلاح اور بچّوں کی عمدہ تربیت کرنے کے اصول اور گر قصّے کے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ حالیؔ کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں مولوی نذیر احمد کے قصّوں جیسی دلچسپی اور فنّی خوبی نہیں مگر مفید اور دلچسپ کتاب ہے اور اس زمانے کی عورتوں میں بہت مقبول تھی۔

مندرجہ بالا چار کتابوں میں سے تین سیرت نگاری سے تعلق رکھتی ہیں۔ حیاتِ سعدی ۱۸۸۱ء میں، یادگارِ غالبؔ ۱۸۹۷ء میں اور حیاتِ جاوید ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئیں۔

سیرت نگاری میں حالیؔ نے ایک نئی راہ اختیار کی جو اب تک اردو میں کسی نے نہ کی تھی اور وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ بعد میں اردو سیرت نگاری اسی ڈگر پر چل پڑی۔ حالیؔ محض ہیرو کی زندگی کے واقعات بیان کرنے اور اس کی خوبیاں گنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کی پوری زندگی اور کردار پر تبصرہ کرتے ہیں اور اس کا تعلّق اس کے زمانے سے دکھاتے اور اس کی اچھائیوں، برائیوں کو حق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ آل احمد سرور نے حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالبؔ کے بارے میں لکھا ہے "یہ دونوں سوانح عمریاں بھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔۔۔۔ زندگی کے حالات بیان کرنے پر حالیؔ زیادہ زور نہیں دیتے ۔۔۔۔ ان کی توجہ شخصیت اور اس کے کارنامے نمایاں کرنے پر رہتی ہے ۔۔۔۔" منشی دیانرائن نگم کا خیال ہے کہ "اردو میں سب سے پہلے حالیؔ نے نئے

طرز کی سوانح عمریاں لکھیں۔ آپ کی حیاتِ سعدی اپنے قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد غالبؔ اور سرسیّد کی سوانح عمریاں لکھ کر آپ نے ملک پر احسانِ عظیم کیا۔ یہ کتابیں اردو کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔ ان میں جس تفصیل اور مردم شناسی کے ساتھ فاضل مصنّف نے اپنے ممدوحوں کے کل واقعاتِ زندگی بلا کم و کاست قلم بند کر دیے ہیں، اس کی بدولت غالبؔ اور سرسیّد دونوں کی روزمرّہ زندگی، ان کے عادات و خصائل، بود و باش مصائب و مشکلات اور خدمات و سیرت کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ دونوں کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے ذاتی واقفیت اور صحیح معلومات کی بنا پر لکھا گیا ہے۔ اس پر بھی کہیں ذاتی محبت اور دلی عقیدت واقعہ نگاری کے فرائض پر غالب نہیں آنے پائی۔" ڈاکٹر عابد حسین کی بھی یہی رائے ہے کہ "یہ تینوں کتابیں خصوصاً حیاتِ جاوید محض واقعات کی پوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمریوں کا نمونہ ہیں۔"

حیاتِ سعدی

حالیؔ کی لکھی ہوئی یہ سب سے پہلی سوانح حیات ہے۔ یوں تو ہندوستان میں صدیوں سے سعدیؔ کا نام مشہور تھا اور ان کی گلستاں اور بوستاں سارے ہند میں بہت مقبول تھیں اور کوئی پڑھا لکھا ایسا نہ تھا جس نے سعدیؔ کا نام نہ سنا ہو اور ان کی دلچسپ اور سبق آموز حکایتوں اور کہانیوں سے واقف اور ان کا مداح نہ ہو۔ سعدی کی جانے کتنی حکایتیں زباں زد تھیں۔ ان کے سینکڑوں اشعار اور مصرعے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود سعدیؔ کی ذاتی زندگی اور حالات سے عام طور پر ناواقفیت تھی۔ دراصل حالیؔ ہی نے فارسی کے اس باکمال شاعر اور بے مثل ادیب کی زبردست شخصیت کو ہندوستانیوں سے متعارف کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر فارسی کے بہت سے بلند پایہ شاعروں میں سے حالیؔ نے سوانح عمری لکھنے کے لیے سعدیؔ ہی کا کیوں انتخاب کیا؟ اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ فارسی کے شاعروں میں سب سے زیادہ جس شاعر نے انھیں متاثر کیا وہ سعدیؔ ہیں۔ انھیں سعدیؔ سے ایک خاص لگاؤ اور

بڑی عقیدت ہے۔ سعدی کی شخصیت اور اس سے بھی زیادہ ان کے ادبی کارناموں نے حالی کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ سعدی نے اپنے قلم سے اخلاقی اصلاح کا کام لیا تھا۔ اور حالی طبعاً اس چیز سے متاثر ہوئے۔ حالی کے اپنے کلام پر سعدی کا اثر کافی پایا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے لوگ ان کو "سعدیِ ہند" کہنے لگے۔ لیکن سعدی اور حالی میں ایک نمایاں فرق ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سعدی مصلح ضرور تھے مگر ان کے ہاں شاعر اور آرٹسٹ کا رنگ پھر بھی غالب رہتا ہے۔ خاص طور پر ان کی نثر ان کی نظم سے بھی زیادہ دلکش اور حسین ہوتی ہے۔ حالی بھی مصلح ہیں لیکن برخلاف سعدی کے ان کے کلام میں اکثر جگہ ناصح اور مصلح کا رنگ غالب آجاتا ہے۔

اس کتاب میں حالی نے شیخ سعدی کے بچپن اور جوانی کے حالات بڑے دلچسپ اور دل نشیں انداز میں بیان کیے ہیں اور ان کی زندگی کے مختلف دوروں اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے حصے میں شیخ سعدی کے کلام کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے اور ان کا موازنہ دوسرے شعرا سے کرکے ان کی برتری ثابت کی ہے۔ ان کی نظم و نثر کی خوبیاں اور صناعیاں بڑی وضاحت سے نمایاں کی ہیں اور ان کی تصنیفات کی اصلاحی اور اخلاقی قدروں پر بہت زور دیا ہے۔

حیاتِ سعدی کا یہ حصہ پڑھیے جس میں حالی نے سعدی کی دونوں مشہورِ عالم کتابوں گلستاں اور بوستاں پر تبصرہ کیا ہے۔

"ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لبِّ لُباب سمجھنا چاہیے۔ ظاہراً فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوعِ خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں ان کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھے سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی اور بڑھاپے تک مطالعے کا شوق رہتا ہے۔ لاکھوں استادوں نے انھیں پڑھایا اور کروڑوں شاگردوں نے انھیں پڑھا۔ ان کے بے شمار نسخے خوش نویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں

میں ان کے ترجمے ہوئے۔ مشائخ اور علما نے ان کی عزت کی، بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دار العمل بنایا۔ منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکایا اور ان کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا۔ ان کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

"اگرچہ یہ دونوں کتابیں حُسنِ قبول، فصاحت، بلاغت، تہذیب، اخلاق، پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دِگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے۔ بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے اَحَدُهُمَا اَفْضَلُ مِنَ الْاٰخَرِ لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دی جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

فارسی نظم میں بوستاں کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستاں سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں۔ بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامے نے شاید اس سے بھی بڑھ کر مقبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہراً کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو۔ سر گور اوسلی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جنٹیس نے لاطینی میں کیا تھا؛ اس نے مدتوں یورپ کے اہلِ علم حضرات کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے۔

"تذکرۂ مجمع الفصحا جو کہ ایران میں تالیف ہوا ہے، اس میں یا کسی اور تذکرے میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ایسی اور کوئی کتاب نہیں ہوئی۔ شاہ نامہ، مثنوی معنوی، گلستاں اور دیوانِ حافظ۔

"ہندوستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں جیسی ایران میں، مگر سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بے ساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور مقبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دلفریب چیز نہ ہو۔ کیونکہ نظم و نثر کی بلیغوں

کتابیں جو تکلف اور تصنع سے بالکل پاک ہیں، ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں جانتا۔۔۔۔ گلستاں کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر عزیز زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے، ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ خود شیخ ہی کے زمانے میں گلستاں کے اکثر قطعات وابیات اس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری ہوگئے تھے کہ اس زمانے کے فضلا اور ادبا۔ اس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کرکے اپنا زورِ طبع اور قدرتِ زبان دکھاتے تھے۔۔۔۔"

(حیاتِ سعدی)

یادگارِ غالبؔ

حالیؔ کی دوسری سوانح عمری یادگارِ غالبؔ ہے۔ غالبؔ حالیؔ کے مربّی اور دوست تھے، اور حالیؔ ان کی سیرت اور شخصیت سے بہت متأثر اور ان کے کلام کے حُسن وخوبی اور عظمت کے دل سے قائل تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ زمانے کا مذاق گِرا ہوا ہے۔ غالبؔ کے مقابلے میں دوسرے گھٹیا شاعروں کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور غالبؔ کو مشکل پسند مہمل گو وغیرہ سمجھا جاتا ہے اور چند بامذاق حضرات کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ غالبؔ کے کلام کی خوبی اور عظمت سے ناواقف ہیں۔ یادگارِ غالبؔ لکھنے سے حالیؔ کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ان کے کلام کا صحیح مقام اور اس کی خوبیاں اور خصوصیات سمجھائیں اور اس طرح اُن کا مذاقِ شعر سنواریں، اور ساتھ ہی غالبؔ کی سیرت اور حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیں۔ حالیؔ نے اس میں بھی واقعاتِ زندگی پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کتاب کا چوتھائی حصہ سوانح حیات سے متعلق ہے۔ لیکن اگرچہ انھوں نے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے نہیں دکھائے پھر بھی ان چند صفحات ہی میں غالب کی دلکش شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ بے اختیار پڑھنے والے کے دل میں اُن کی محبّت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غالبؔ کی شرافت اور وضعداری، سخاوت، سیرچشمی، اُن کی ظرافت، خوش مزاجی، اُن کی مشکلات ومصائب، ان کی طبیعت

کی اُفتاد، ہر چیز اس خوبی سے دکھائی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود اس تاجدارِ سخن کے دربار میں موجود اس کی صحبت سے لُطف اُٹھا رہے ہیں۔

پہلے حصّے کے اختصار کی کسر حالیؔ نے دوسرے میں نکال دی۔ اس میں نہایت تفصیل سے غالبؔ کے کلام کی خصوصیّات، اُن کے اشعار کے مطالب، طرزِ بیان کی خوبیاں اور نُدرتیں اور زبان کی نزاکتیں اور جدّتیں بیان کی گئی ہیں۔ یادگارِ غالبؔ کے ذریعے حالیؔ نے نہ صرف غالبؔ کے اشعار سمجھنے کا گُر سمجھایا اور غالبؔ کے کلام کی اہمیّت اور اس کا بلند مقام بتایا اور ان کی شخصیت اور کلام کی ترجمانی کی، بلکہ سچ پوچھیے تو بہت کچھ ملک کا مذاقِ شعر ہی بدل دیا۔ آج ہم ہر کسی کو غالبؔ کے اشعار پڑھتے اور جھومتے دیکھتے ہیں۔ یہ حالیؔ کی بدولت ہے۔ آلِ احمد سرور نے صحیح لکھا ہے کہ "غالبؔ کی شاعری اپنے زمانے میں خواص تک محدود رہی، عوام تک اسے پہنچانے اور غالبؔ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بٹھانے میں یادگار کا بڑا حصّہ ہے۔ ان کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیّت اعتدال ہے۔ وہ نہ بجنوری کی طرح غالبؔ کو آسمان پر بٹھا دیتے ہیں اور نہ لطیف کی طرح ان پر بے آہنگی کا الزام لگاتے ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کی جو خصوصیّات گنائی ہیں، تمام نقادوں حتیٰ کہ اکرام کا بھی فیصلہ ہے کہ غالبؔ کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید یادگار میں ملتی ہے۔ اُنھوں نے غالبؔ کے مشکل اشعار کی شرح کرکے غالبؔ کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے اور فارسی کے بعض شعرا سے اُن کا موازنہ یک طرفہ نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے۔۔۔۔" خود حالیؔ نے یادگار کے دیباچے میں لکھا ہے "اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُن کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی ایک کام نے اُن کی لائف کو دارالخلافہ کے آخری دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم ونثر کا خاتمہ ہوگیا اور اُردو نظم ونثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔ اس لیے کبھی کبھی مجھے اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے حالات جس قدر معتبر ذریعے سے معلوم ہو سکیں اور ابنائے زماں کے فہم سے بالاتر نہ ہوں اُن کو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں۔"

حالیؔ کے بعد غالبؔ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، اُن کے کلام کی کئی شرحیں شائع ہوئیں لیکن ان سب کی بنیاد یادگارِ غالبؔ پر رکھی گئی ہے اور اسی سے سب نے خوشہ چینی کی ہے۔

"یادگارِ غالب" کی زبان اور طرزِ بیان حالیؔ کی اور سب کتابوں سے زیادہ دل کش اور دل نشیں ہے۔ اور پڑھنے والوں کو اس کی تنقیدی اور ادبی عظمت کے باوجود اس میں ایک داستان کا سا لطف معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کی تمام نثری تصانیف میں یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہوئی ہے۔ اس مقبولیت میں خود غالبؔ کی دل کش شخصیت کو بھی یقیناً دخل ہے لیکن اس کا اندازِ بیان بھی ایسا ہے کہ ایک دفعہ کتاب ہاتھ میں لے کر بغیر پورا کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔

غالبؔ کے منتخب اشعار کے معنی سمجھانے میں تو حالیؔ نے کمال ہی کر دیا ہے۔ اور اس خوبی اور حسن سے غالبؔ کے بعض پیچیدہ شعروں کے مطالب بیان کیے ہیں کہ ان میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

نمونے کے طور پر ہم یہاں "یادگارِ غالب" کے ایک باب کا کچھ حصّہ دیتے ہیں جس میں انھوں نے غالبؔ کے مذاقِ شعر اور ان کے کلام پر بحث کی ہے:

"یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ محض تفننِ طبع کے طور پر کبھی دوستوں کی فرمائش سے اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتد بہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدر دانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہے گاہے حضرتِ ظلِّ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔

"قطع نظر اس کے وہ زمانے کے خیالات کے مطابق اردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعے میں جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوقؔ کی طرف خطاب ہے کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است
راست میگویم من واز راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخرِ تُست آں ننگِ من است

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اس لیے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور اہمیت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے ......

"مرزا کے اُردو کلام میں جیسا کہ اُوپر مذکور ہوا ہے غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں، وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔ اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کو جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا......

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مئے مرد افگنِ عشق کا ساقی، یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بُلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی

ضرورت ہوئی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ ہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اسی مصرعے کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے ع "کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگنِ عشق" یعنی کوئی ہے جو مئے مردافگنِ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعے کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے ع

کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگنِ عشق

اس میں لہجے اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعۂ مذکورہ کی تکرار کروگے فوراً معنی ذہن نشیں ہو جائیں گے۔"

(یادگارِ غالب)

بعض نقاد اور معترض کہتے ہیں کہ حالی اپنے ممدوح کو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں لیکن یہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ حالی کے ہاں ہمیں انصاف پسندی اور اعتدال بڑی حد تک نظر آتا ہے۔ جہاں وہ ممدوح کی خوبیاں اُجاگر کرتے ہیں وہاں اس کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں۔ ہاں وہ انسانی کمزوریوں کو فردِ جرم بنا کر پیش نہیں کرتے۔ یادگارِ غالب میں اُنھوں نے غالب کی کمزوریوں کی طرف اشارے کیے ہیں مثلاً جہاں "راقم اور غالب کا معاملہ" لکھا ہے اور جس میں اپنی "گستاخی" دکھائی ہے اس میں اگرچہ حالی اپنی تنگ نظری اور تعصب کا ذکر کرتے ہیں مگر اسی کے ساتھ اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ غالب مذہب کے ظاہری احکام کے پابند نہ تھے۔ آج یہ چیز قابلِ اعتراض نہ سمجھی جائے مگر اس وقت مخصوصاً حالی جیسے ثقہ و پرہیزگار کی نظر میں باوجود ساری محبت اور عقیدت کے یہ بات بڑی بُری تھی۔ لیکن حالی کی انصاف پسندی یہاں بھی آڑے آئی۔ وہ اگرچہ ظاہری مراسمِ مذہبی کو بہت ضروری سمجھتے ہیں مگر اس دل کی بھی قدر کر سکتے ہیں جو ان ظاہری آداب و رسوم سے بے گانہ ہوتے ہوئے بھی نورِ ایمان سے روشن ہوا اور جس میں انسانیت کے لیے

سچا درد موجود ہو۔ وہ غالب کے اس پہلو کو جگہ جگہ اجاگر کرتے، اس "پوشیدہ ولی اور کھلے کافر" کی ان خصوصیات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ حالی کو غالب کی ایک اور ادا جو بہت پیاری ہے وہ ان کی ظرافت ہے۔ انھوں نے "یادگار" میں غالب کے بہت سے دلچسپ لطیفے بیان کیے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو حیوانِ ناطق کی جگہ حیوانِ ظریف کا خطاب دے دیا ہے۔

حیاتِ جاوید

ایک ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب، جو ۱۹۰۱ء میں سر سید کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، حالی کی سات سال کی "محنتِ شاق" کا نتیجہ ہے۔ وہ اسے کئی سال سے مرتب کر رہے تھے، لیکن انھوں نے کبھی سر سید کو دکھائی اور نہ سر سید نے دیکھنے کی خواہش کی۔ جب سر سید کا انتقال ہو گیا تو حالی کو اس بات کا بڑا قلق ہوا کہ انھوں نے اس کا مسودہ سر سید کو کیوں نہ دکھایا تاکہ انھیں اندازہ ہوتا کہ ان کے بارے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ سر سید کی وفات کے بعد حالی اور بھی تندہی سے اس کی تکمیل میں مشغول ہو گئے تاکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اُن کے محسن کی سیرت جلد سے جلد پہنچے اور اس سے سبق لے سکیں۔ لیکن وہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کام خراب ہو جائے۔ اپنے ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں: "لوگ ہر طرف سے اصرار کر رہے ہیں کہ دو تین مہینے کے اندر اندر کتاب مکمل کر دو۔ مگر میں ہرگز کسی کی نہیں سنوں گا اور جب تک میرے حسبِ دلخواہ سر سید کی لائف مکمل نہ ہوگی اس وقت تک اُس کا شائع ہونا نہ چاہوں گا۔ عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لالچ دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لائف تیار ہوگی اُسی قدر کثرت سے فروخت ہوگی۔ مگر اس بات کی مجھے مطلق پروا نہیں۔ لائف عمدہ لکھی جائے اگرچہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو" یہ ہے ایک سچے فن کار کا نقطۂ نظر۔

یہ خط اپریل ۱۸۹۸ء کا ہے۔ دو سال بعد مارچ ۱۹۰۱ء میں حیاتِ جاوید چھپ کر

تیار ہوئی تو مولانا حالی نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا "خدا کا شکر ہے کہ یہ فرض ادا ہو گیا اور یہ کہنے کی کسی کو گنجائش نہ رہی کہ جس شخص نے قوم کی ایسی خدمات کیں قوم میں کسی کو اس کی لائف لکھنے کی توفیق نہ ہوئی"

اگرچہ اس سے پہلے حالی سیرت کی دو کتابیں لکھ چکے تھے۔ مگر اس کتاب کے لکھنے میں انھوں نے جو ڈھنگ اختیار کیا اور جو اصول ان کے پیشِ نظر تھے، ان کی تشریح کے لیے حیاتِ جاوید کے دیباچے کا تھوڑا سا اقتباس پڑھیے:۔

"ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن، اوّل تو ایسی بایوگرافی چاندی سونے کے ملمعے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اس کے سوا وہ اُنھیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے۔ ان کو سب نے بھلا جانا۔ کیوں کہ ان کو کسی کی برائی سے سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیوں کہ انھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیکھ سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علما مفسّرین کو للکارا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے، اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے؟ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھونک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر پر نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے

پہلے اس کی لائف سے اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے۔"

سرسیّد سے حالی کی عقیدت کی بڑی وجہ اس بلند مقصد اور قومی خدمت سے ان کی محبت تھی، جو سرسیّد کے پیشِ نظر تھا۔ حالی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی رہ نمائی اور اصلاح کا جو حق سرسیّد نے ادا کیا اور جس طرح اپنی پوری زندگی قومی خدمت میں بسر کی وہ ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم سرسیّد کے عظیم الشان کاموں اور پُرخلوص خدمات کو حقیقت اور صداقت کی روشنی میں دیکھے اور اس سے سبق لے اور قومی رہنما اُن کی سیرت اور کارناموں سے سیکھیں کہ قوم کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن اُن کا منشا محض سرسیّد کے "فضائل و مناقب" بیان کرنا اور "مدلّل مداحی" نہیں تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ بلکہ حالی نے پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ سرسیّد کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں اور ان کے کارناموں کو تنقیدی نظر سے پرکھا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انسان کو اپنے عزیز یا دوست کی کمزوریاں ذرا مدھم اور خوبیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے اگر حیاتِ جاوید میں سرسیّد کی تعریف کا پہلو ضرورت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے تو مقامِ تعجب نہیں۔ جہاں تک عمداً "مدلّل مداحی" کا سوال ہے۔ حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس لیے یہ کسی طرح قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے سرسیّد کے لیے جو کچھ لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھیے کہ حالی پچیس سال تک سرسیّد کے نہایت قریبی دوست رہے تھے اور انھوں نے ان کی سیرت اور شخصیت کو قریب سے دیکھا اور ان کے کاموں میں ان کا ساتھ دیا اور ہاتھ بٹایا تھا۔ سرسیّد کے مقاصد اور ان کی صفات اور ان کے نقطۂ نظر کو جس طرح وہ سمجھ سکتے تھے دوسروں کے لیے مشکل تھا۔ کسی انسان کی سیرت اور کاموں کو ٹھیک ٹھیک وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارا ہو اور خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ رہا ہو۔ حالی سرسیّد کے دوست، رفیقِ کار، معتقد اور دیرینہ

ساتھی تھے، اس لیے ان کی سیرت اور کارناموں سے قوم کو روشناس کرانے کا حق حالیؔ سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا تھا؟ چنانچہ انھوں نے حیاتِ جاوید میں سرسید کی ایک مکمل اور جامع تصویر دکھائی اور مورخ و نقاد دونوں کے فرائض کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انھوں نے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سرسید کی زندگی اور کاموں کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس کتاب میں سرسید کے ساتھ ساتھ قوم کی ذہنی زندگی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے بقول آلِ احمد سرورؔ "اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آگئی ہے۔ حالیؔ نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا، بالکل صحیح ہے۔ اور انھوں نے سرسید، مذہبی خدمات پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالیؔ کے ہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو "مدلل مداحی" یا "کتاب المناقب" اور ایک رُخی تصویر کہا گیا، حالاں کہ سوانح نگاری میں یہ سنگِ راہ کا کام دیتی ہے۔"

حیاتِ جاوید کی زبان اور طرزِ بیان بہت رواں اور سلجھا ہوا ہے۔ باتوں باتوں میں بڑے بڑے مشکل مسائل پانی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کہیں ذہن اٹکتا ہے نہ دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ ان کے ایک نقاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "حیاتِ جاوید میں تو انھوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے ہیں اور ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے جو اپنی جگہ سے اٹھایا نہیں جا سکتا......"

لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود اگرچہ "حیاتِ جاوید" نے شہرت بہت پائی لیکن پھر بھی اسے اتنی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی جتنی حالیؔ کی بعض دوسری تصانیف کو ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ قوم کے ناشروں اور کتب فروشوں نے شروع سے اس سے بے اعتنائی برتی۔ اس قدر قابلِ قدر اور نتیجہ خیز کتاب کے مقابلے میں، جس کی قدر صرف صاحبِ ذوق اور علم دوست حضرات ہی کر سکتے تھے، انھوں نے زیادہ بکنے والی کتابوں کی اشاعت میں روپیہ لگانا پسند کیا اور اس لیے کتاب کی اتنی اشاعت نہ ہو سکی جتنی ہونی چاہیے تھی۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آج کل کا زمانہ تیز رفتاری کا ہے لوگوں کی مصروفیات حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، ہر کام میں عجلت اور ہر چیز میں اختصار پسند کیا جانے لگا ہے۔ ناولوں کی جگہ مختصر افسانے نے لے لی ہے۔ کتابوں کی جگہ ان کے خلاصے پسند کیے جاتے ہیں.... اس لیے ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب پڑھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

شاید ایک اور وجہ یہ بھی ہو کہ سرسید کے بعد ان کی طرف سے غلط فہمیاں پھیل گئیں۔ لوگ سرسید کے اصلی مقصد کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کی شخصیت سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔ اس لیے ان کی سیرت کو پڑھنے اور ان کے کارناموں کو سمجھنے کی زیادہ طلب نہ رہی۔ نئے زمانے میں ایک گروہ یعنی ترقی پسندوں نے سرسید کو انگریزی حکومت کا خیر خواہ اور ساتھی سمجھ کر نا قابلِ اعتنا جانا۔ دوسرے گروہ یعنی رجعت پسندوں نے ان کی وقتی مصلحت کو ان کا اصولِ زندگی قرار دے کر ان کی تصویر میں اپنے رنگ بھر دیے، یعنی ان کو پورا ابن الوقت بنا دیا۔ حالانکہ اگر "حیاتِ جاوید" کا غور سے مطالعہ کیا جاتا تو ان دونوں فریقوں کی غلط فہمی دور ہو جاتی اور سرسید کا مقصد اور مشن آئینہ ہو جاتا۔ ہمارا خیال ہے کہ سرسید کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں اُن کو دور کرنے کی ایک یہی صورت ہے کہ کوئی صاحبِ نظر مورخ اور ادیب "حیاتِ جاوید" کا خلاصہ مرتب کر کے شائع کرے، اس طرح ایک طرف سرسید کی سیرت سے قوم روشناس ہو گی۔ دوسری طرف حالیؔ کی یہ ادبی اور قومی محنت سوارت ہو گی اور یہ انمول کتاب جو آج کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہے قبولیت کا وہ درجہ پا لے گی جس کی وہ حقدار ہے۔

یہاں ہم "حیاتِ جاوید" کا ایک اقتباس دیتے ہیں۔ جس میں حالیؔ نے سرسید کی ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

"سرسید کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ قطعِ نظر

ان جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا، اتفاقاتِ حسنہ نے بھی ان کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ ان کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسّل گھرانے کی یادگار تھی اور اُن کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت، حسنِ تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانے کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی ان کی ماں ایک نیک نہاد، سنجیدہ اور دانش مند بی بی تھیں، جن کی تعلیم و تادیب سر سیّد جیسے جوہر قابل کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ انھوں نے حسنِ اتفاق سے ایسی حالت میں نشو و نما پائی کہ نہ ان کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا۔ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ مگر اپنے رشتے داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی کہ جدھر منہ اُٹھ گیا چل نکلے۔

ان کے والد ایک آزاد منش اور تعلقاتِ دُنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سر سیّد کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنے اور رعب و داب کے نہایت متحمّل اور بردبار تھیں۔ پس وہ بے جا تشدّد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانے میں اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلّت بیٹھ جاتی ہے سر سیّد پر کبھی نہیں گزری۔

جوانی کے آغاز میں سر سیّد کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی۔ وہ

اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی ان کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتشگیر مادّہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوانِ شباب میں ہوا و ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حُبِّ قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا، اور میرؔ کا یہ شعر سر سیّد کے حال پر منطبق ہو گیا ؂

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

جس حد تک کہ سر سیّد کی تعلیم ہوئی اس کو بھی ان کی ترقی کا مؤید سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جیسا کہ پہلے حصّے میں بیان ہو چکا ہے، قدیم یا جدید کسی طریقے میں پوری تعلیم حاصل نہیں کی۔ اگر وہ پرانے طریقے کی تعلیم پوری کر لیتے اور علومِ قدیمہ کا رنگ اُن پر پوری طرح چڑھ جاتا، پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کو قبول کرنے کی قابلیت اُن میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ جاتے اور تعصّب کے تو بر تو پردے ان کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقے کی تعلیم بھی ان نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سر سیّد سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجے کی سویلزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں، وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں، محض بے سود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ سر سیّد کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا ہونا منجملہ ان اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے انھیں جھجکنے

نہیں دیا ۔"

(حیاتِ جاوید)

حیاتِ جاوید کی طرف سے اس وقت قوم نے جو بے توجہی برتی اس کا حالی کو بڑا قلق تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی چھ سات سالہ جاں کاہ محنت کا یہ ثمر ملا۔ اگرچہ اس کا افسوس ہونا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن حیاتِ جاوید کا مصنّف شہرت کا پرستار اور تحسین کا بھوکا نہ تھا۔ وہ کام کا اصلی انعام خود کام کو سمجھتا تھا۔ انھیں رنج اس بات کا تھا کہ انھوں نے اپنے نزدیک مسلمانوں کے محسن اور قوم کے ایک بے مثال فرزند کی یہ سیرت اس خیال سے لکھی تھی کہ قوم اس سے سبق حاصل کرے گی اور اپنی گرتی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں کیسے دل شکستہ انداز میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ اس قلیل عرصے میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہوگئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے وہی شخص خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف وتالیف کا کوئی اور مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ کے لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی مگر میرا یہ خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسید کا کوئی دوست کتاب کا بالکل نوٹس دے۔ اور اخباروں کو جانے دیجیے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ جس کو سرسید کی یادگار کہا جاتا ہے..... اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارِ گراں کو اپنے ذمے لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرضِ کفایہ سے سبک دوش کیا ہے۔ ۔ ۔"

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کی بے وقعتی نے ہیرو کی قدر بھی گھٹا دی ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ آج پچپن برس بعد بھی اردو داں طبقے میں یہ احساس اور بیداری نہ پیدا ہو سکی کہ وہ اس قابلِ قدر کتاب کی اصلی خوبی اور بڑائی کو سمجھتی۔ حالی کی عظمت اور بڑائی، حالی کی خدمات اور کارناموں کا تو ہم بہت کچھ اعتراف کرتے ہیں، لیکن حالی کی تصانیف کی طرف

سے یہ بے اعتنائی برتتے ہیں! حالی اور سرسید دونوں کی ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات کیا اس کی مقتضی نہیں ہیں کہ نہ صرف حیاتِ جاوید بلکہ سرسید اور حالی کی کل تصانیف کو اہتمام، خوبی اور صحت کے ساتھ شائع کرایا جائے! مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ ادبیات اور انجمن ترقی اردو دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے اور انھیں اسے پورا کرنا چاہیے تاکہ آئندہ نسلیں ہم پر یہ الزام نہ لگا سکیں کہ ہم اپنے بہترین سپوتوں اور بہترین ادیبوں تک کے کارناموں سے بے پروائی برتتے رہے۔

مقدمۂ شعر و شاعری

یہ کتاب حالی کی نثر کی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے۔ حالی نے ۱۸۹۳ء میں جب اپنی قدیم اور جدید غزلوں اور متفرق کلام کا مجموعہ اس مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا تو ہر طرف سے شورِ تحسین اور غوغاے مخالفت بلند ہوا۔ لکھنؤ اسکول میں تو آگ ہی لگ گئی کیونکہ اس مقدمے نے فنِ تنقید کی جو نئی راہ نکالی تھی اس کی کسوٹی پر کسے جانے کے بعد اس زمانے کے بیشتر شعرا کا کلام نکما ثابت ہوتا تھا۔ حالی سے پہلے شعر کو عروض کی کسوٹی پر کسنا، اس کے لفظوں، ترکیبوں اور محاوروں پر اساتذہ کی سند لانا اور تذکیر وتانیث کی بحثوں میں الجھنا ہی شعر کی تنقید سمجھا جاتا تھا۔ حالی نے اس راہ کو چھوڑ کر شعر کے بنیادی اصولوں سے بحث کی کہ شاعری کا اصل مقصد کیا ہے اور اُردو شاعری اُسے کہاں تک پورا کرتی ہے؟

ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں کہ "یہ مقدمہ اُن کے حسنِ ذوق اور وسعتِ نظر اور جدتِ خیال کا آئینہ ہے۔ جب کوئی غیر شاعر شعر کی تنقید پر قلم اٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر حالی خود شاعر ہیں۔ اس لیے انھوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اُردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ حالی ہی نے پہلے پہل یہ بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا

ہے اور وہ شعر میں کیسے پیدا ہوتی ہے ......"

اس مقدمے میں انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدے، مرثیے وغیرہ پر الگ الگ اور مفصّل بحث کی ہے اور ان سب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اُن کی ضرورت، اُن کا صحیح مقام سمجھایا ہے اور بتایا ہے کہ اُن سے کیسے اور کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اصلیت، سادگی اور جوش کو شعر کی کسوٹی بنایا اور اس پر مختلف اشعار کو کس کر دیکھا اور دکھایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ کامیاب شعر میں ان تینوں صفتوں کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ وہ غزل پر کڑی تنقید کرتے ہیں مگر دراصل وہ اس کے مخالف نہیں بلکہ اس رنگ کے خلاف ہیں جو متاخرین نے غزل کا کر دیا تھا۔ آل احمد سرور کا خیال ہے کہ "ان کا اعتراض لکھنؤ اسکول پر ہے جس نے شاعری کو غزل میں اور غزل کو رعایتِ لفظی اور نازک خیالی میں محدود کر دیا۔ انھوں نے قدما کی اس وجہ سے تعریف کی ہے کہ وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں بلکہ دل کی بات سنا کر انسان کو مسحور کرتے ہیں۔ قصیدے سے چونکہ مبالغہ، جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کی ترقی ہوتی ہے اور اُن سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے اس لیے حالیؔ اس کی مذمت کرتے ہیں اور مرثیہ اور مثنوی نے چونکہ اردو شاعری میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں رنگ پیدا کیے اس لیے انھیں سراہتے ہیں ....."

حالیؔ نے حکیمانہ انداز اور فلسفیانہ نظر سے شعر کی اصلی اور بنیادی صفات پر مفصّل اور مدلّل بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ شاعری کا مقصد محض لفظوں سے کھیلنا اور خیالی طلسم بنانا نہیں بلکہ اس سے بہت بلند و برتر ہے۔ شعر کا کام سچّے وارداتِ قلب کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھے :

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور شعر کا کام قوم کو اصلاح کی طرف متوجّہ کرنا اور اور اس کو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر ڈالنا، اس میں اچھا ذوق اور اچھّے کام کی قدر پیدا کرنا بھی ہے۔ انھوں نے ثبوت میں بہت سے مغربی اور مشرقی شاعروں کو حوالے بھی دیے ہیں۔

دیوانِ حالیؔ کے دیباچے میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے "نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مُراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن تک ان کی رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مُراد ہیں جو شاعر و ناشاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر ہیں مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور مبتذل ہیں اُن کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور اُن کی طرف بہت کم التفات کیا گیا، اور پایۂ شاعری کو اُن سے وراء الوراء سمجھا گیا۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید اُنھیں مبتذل خیالات میں چھپا ہوا ہے جو بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا :

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر — پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے"

پھر آگے چل کر کہتے ہیں ...." الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزولِ مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانے کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقے کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے..."

یہی نئی یا ترقی پسند شاعری کی بنیاد تھی جو حالیؔ کے ہاتھوں رکھی گئی۔ مگر حالیؔ پرانی عمارت کے مسالے سے نئی عمارت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا اصول یہ نہیں تھا کہ سرے سے عمارت کو ڈھا کر کہیں اور سے ایک نئی چیز بنا کر لا کھڑی کی جائے۔ دراصل حالیؔ اور اقبالؔ کی کامیابی اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کو زبان اور بیان پر پوری قدرت تھی اور ساتھ ہی شعر و ادب کے سارے پُرانے ذخیرے پر اُن کو عبور حاصل تھا۔ قدیم شعرا کا سارا سرمایہ اُن کا کھنگالا ہوا تھا اور پرانی تشبیہیں، استعارے، تلمیحیں اور الفاظ نئے خیالات کو ادا کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ ان سے سُننے والوں کے کان مانوس تھے اس لیے وہ انھیں آسانی سے قبول کر سکتے تھے۔ حالیؔ خود کہتے ہیں "جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرزِ بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیا اور دھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیے تھے، مگر اسلوبِ بیان میں مطلق فرق

نہیں آیا۔ جو تشبیہیں استعارے پہلے مدح، ہجو، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے، وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقۂ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیّاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہلِ ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیے اسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے اور اپنی وضع، صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کردے اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کے طرزِ بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔" حالی میں اور موجودہ دور کے نئے شعرا میں یہ ایک بہت بڑا فرق ہے۔ اگر جدید زمانے کے شاعر حالی کے اس مشورے پر عمل کرتے اور شعر کی قبولیت کے اس گُر کو سمجھ جاتے اور ساتھ ہی قدما کے کلام پر عبور بھی حاصل کرتے تو انھیں اس سے کہیں زیادہ قبولیت اور کامیابی حاصل ہوتی جتنی ہوئی ہے۔

اس مقدمے میں حالی نے شعر کی ضرورت اور تاثیر کو تو ضرور تسلیم کیا ہے لیکن اس میں انھوں نے زیادہ تر شعر کی اخلاقی اور سماجی حیثیت پر نظر ڈالی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ چونکہ پہلے صرف شعر کے جمالیاتی پہلو کو اہمیت دی جاتی اور اسی پہلو سے بحث کی جاتی تھی اس لیے ردِ عمل کے طور پر حالی نے جو نظریہ پیش کیا اس میں انھوں نے شعر کے افادی اور اخلاقی پہلو ہی پر زور دیا اور اس کے جمالیاتی عنصر کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن کوئی بحث اور کوئی نظریہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہر پہلو جائزہ کیا جائے مقدمے میں یہ کمی بہت کھٹکتی ہے اور اس بنا پر جو اعتراض کیے گئے ہیں وہ ایک حد تک صحیح ہیں۔

آج کل بعض نقّاد حالی کے مقدمے کا موازنہ یورپین نقّادوں کی کتابوں سے کر کے اُسے پست اور گھٹیا اور سطحی کتاب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ یورپ زدہ لوگ جن کے ذہن مغرب کی غلامی میں گرفتار ہیں شاید اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہر زبان کے ادب کی خصوصیات الگ ہوتی ہیں۔ خصوصاً مقدمہ جو اردو میں اپنے رنگ کی تنقید کی پہلی کتاب ہے اُسے مغربی ادب کی کسوٹی پر کسنا کہاں تک جائز ہے؟ مقدمے کے مصنّف (اور اُس وقت کا اردو ادب) انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ مغربی لٹریچر پر بھی انھیں پورا عبور حاصل نہ تھا۔ انھوں نے مغربی ادب کی موٹی موٹی بنیادی صفات کو (بعض کتابوں سے ترجمے پڑھ کر) ضرور سمجھا تھا وہ اس پر خود عمل کرنے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو وہ اصول سمجھاتے تھے مگر انھوں نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ یورپ کے اعلیٰ پاس کے نقّادوں کے برابر یا ان سے بڑھ کر ہیں۔ بلکہ حالی تو کسی بھی ایسے موقعے پر اپنی نارسائی اور عجز کا اظہار کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

یہ کتاب بھی انھوں نے اپنی دوسری کتابوں کی طرح ادب میں جدید رنگ پھیلانے کی خاطر لکھی تھی۔ اور اس لیے یہ کتاب تنقید میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے اس پر بلند سے بلند عمارت تعمیر کر سکتے ہیں لیکن عمارت کی بلندی یا شان و شوکت کی وجہ سے کیا بنیادی پتھر کی ضرورت اور اہمیت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

مقدمۂ شعر و شاعری کا اندازِ بیان مدلّل، رواں، دلچسپ اور پُر اثر ہے۔ عبارت میں سادگی، سلاست اور روانی موجود ہے۔ معنی کی صحت، لہجے کی متانت اور علمی و ادبی نکات کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرنا حالی کا حصّہ ہے۔ اس کی زبان بھی حالی کی وہی مخصوص زبان ہے، جس میں ہندی اور اردو کے خوبصورت اور موزوں الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انگریزی کے کرخت اور بے جوڑ الفاظ نظر بٹو کی طرح آنکھوں میں کھٹکتے اور کانوں کو گراں گزرتے ہیں۔

بہر حال یہ بات بالکل مسلّم ہے کہ مقدمۂ شعر و شاعری جدید رنگ میں فنِ تنقید کی پہلی

کتاب ہے جس نے اردو میں تنقید کا ایک نیا باب کھولا اور اپنے رنگ میں نہایت دلچسپ مفید اور بے مثل ہے۔ آج تک اردو میں تنقید کی جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب مقدمے کی مرہونِ منّت ہیں۔

مقدمۂ شعر و شاعری کا یہ حصّہ "غزل میں اخلاقی مضامین" پڑھیے اس سے حالی کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

"شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین سے ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور دردِ جدائی اور کاہشِ انتظار اور رشکِ اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرائے میں بیان کرنا بہت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچّہ جو چلبلا اور چونچال نہ ہو، دونوں میں کچھ کشش اور گہرائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مسالا موجود ہے جو صدیوں تک نہیں نبٹ سکتا۔ دنیا میں ایک انقلابِ عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی چلی جاتی ہیں اور نئی قومیں اُن کی جگہ لیتی جاتی ہیں، یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کر کے رہ جائے گی۔ بلکہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ ارض پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں۔ کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کو بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیسا ہوا؟ کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ میٹریل غزل کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی

کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہو گئی۔ اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔

"اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری غزل مضمون اوّل سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی کہنی چاہے تو اس میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں۔ مثلاً موسم کی کیفیت، صبح و شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، میلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سنّاٹا، سفر کی روئیداد، وطن کی دل بستگی اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

"الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے۔ شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر ہمیشہ طرح بطرح کے کھانے میسّر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلوّن اور تنوّع نہ ہو، اُن سے جی اکتا جاتا ہے۔ جو گویا صبح سے شام، رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے اُس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے۔

"اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدّت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے اسی طرح ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدّد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمالِ شاعری میں داخل ہے لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں۔ جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوّع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اسی کو چھیڑتے چلے جائیں گے تو بجائے تنوّع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگے گا.....".

(مقدمۂ شعر و شاعری)

حالی کے کلام اور اُن کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک بات کا مجھے بار بار احساس ہوا۔ وہ یہ کہ حالی حقیقت میں تو شاعر تھے۔ شاعر کی ساری خصوصیات، بلند تخیّل، وسیع و گہری نظر، حسّاس و درد مند دل اُن میں موجود تھیں لیکن چونکہ بچپن سے اُن کی تعلیم و تربیت مذہبی ڈھنگ سے ہوئی تھی اور اخلاقی اقدار کی اہمیت اور احترام ان کے دل میں بہت گہرا تھا، ساتھ ہی ہر چیز کے افادی پہلو دیکھنے کی عادت بھی ڈالی گئی تھی، اس لیے وہ شاعر کے ساتھ ساتھ مصلح بھی بنے۔ زندگی بھر شاعر اور مصلح میں کش مکش ہوتی رہی۔ کبھی مصلح نے غلبہ پالیا کبھی شاعر نے اور اسی شاعر اور مصلح کی کش مکش نے حالی کو حالی بنایا۔ ورنہ یا تو وہ محض ناصح مشفق اور زاہدِ خشک ہوتے یا صرف خوش بیان و خوش گو شاعر۔ حالی کی تصویر میں "ایک[1] معلّم، ایک نقاد، ایک مصلحِ قوم کے خد و خال بھی موجود ہیں لیکن دل کی کیفیت جو آنکھوں سے جھلکتی ہے، صاف کہہ رہی ہے کہ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے"

---

[1] مضامینِ عابد

مکتوباتِ حالی

"المکتوب نصف الملاقات" کا مقولہ ہر خط پر پورا نہیں اُتر سکتا۔ خط آدھی ملاقات تب ہی بن سکتا ہے جب اس میں گفتگو کی سی سادگی، بے تکلّفی اور آمد ہو۔ جس خط میں بناوٹ، تکلّف اور آورد ہو وہ ممکن ہے ادب کا ایک شہ پارہ بن سکے (اگرچہ اس میں بھی شبہ ہے) لیکن وہ چیز نہ ہوگی جس سے ملاقات کا سا لطف اور مسرّت حاصل ہوتی ہے ایسے ہی خطوں کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے کہا ہے[1] "ادب میں میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں۔ اس کی بے شمار راہیں اور اَن گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بشرطیکہ لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈرامہ ہو یا کوئی اور مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے۔ اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں بہت جلد بِلاتی اور بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ صرف سادگی ہی ایسا حُسن ہے جسے کسی حال میں زوال نہیں بشرطیکہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہ ہو۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے۔ یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سے دلکش نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اٹھا کر

---

[1] از مکتوبِ حالی

الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف ہماری ہر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے غیروں کے لیے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھ میں جائے گی اور غیروں کی نظر میں اس پر پڑیں گی۔ اسی لیے مصلحتِ وقت کا بھی خیال ہوتا ہے، عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے، تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں، خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے ...... اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے نہ دوسروں سے چوکتا ہے نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے۔ اس وقت اسے نہ خوفِ لائم ہوتا ہے اور نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو بھاتی ہے۔"

غالبؔ سے پہلے اردو میں خط لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ اَن پڑھ اور کم پڑھے لکھے لوگ یا تو زبانی پیام سلام سے کام چلاتے تھے یا پھر "پڑھے لکھوں" سے لکھواتے تھے اور یہ حضرات زیادہ تر فارسی میں خطوط نویسی کرتے تھے۔ اگر اردو میں کوئی خط لکھتا بھی تو وہ اس قدر فارسی آمیز ہوتا تھا کہ اسے اردو خط کہنا ہی مشکل تھا۔ سب سے پہلے غالبؔ نے اس چیز کو محسوس کیا کہ دل کی باتیں کہنے کا یہ ڈھنگ ناموزوں ہے اور انھوں نے نہ صرف اردو میں خط لکھنا شروع کیا بلکہ ایسے انوکھے اور پیارے انداز میں خط لکھے جو صرف غالبؔ ہی لکھ سکتے تھے۔ وہ اگرچہ اشعار میں معنی آفرینی، بلند پروازی، نازک خیالی کے نئے نئے جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن خطوں میں بڑے دل نشیں اور سہل انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خط، ان کے اشعار سے کم مقبول نہیں ہوئے۔ لیکن غالبؔ کے خطوں میں جو "سادگی و پُرکاری" ملی جلی ہے وہ بجائے خود ایک قسم کا تصنّع ہے۔ اگرچہ یہ انداز بڑا دلکش لگتا ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک آورد موجود ہے۔ اس طرز میں غالبؔ کا پورا پورا تتبع کوئی بھی نہ کر سکا، اس کے غالبؔ کی سی طبیعت، ان کا سا مزاج اور ان کی سی شوخیِ طبع اور روانیِ قلم کی ضرورت تھی جو ہر کسی کے بس کی چیز نہیں۔ البتہ ان کی وجہ سے اردو میں خط لکھنے کا رواج عام ہو گیا اور اب اردو میں خط لکھنا گھٹیا اور کم درجے کی بات نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ البتہ جن بندھے ٹکے فقروں اور لمبے چوڑے القاب و آداب

کی لوگوں کو عادت پڑی ہوئی تھی وہ اب بھی باقی رہے۔ گنتی کے چند لوگوں نے غالبؔ کی سادگی اور بے تکلّفی کو ضرور اپنایا۔ ان میں حالؔی کا نام سرِفہرست ہے۔

غالبؔ اور حالؔی کے خطوط ایک ساتھ پڑھیے تو آپ کو اُن میں وہی فرق نظر آئے گا جو ان دونوں کی شخصیت، سیرت اور شاعری میں ہے۔ ایک میں شوخی ہے، بیباکی ہے، ندرتِ بیان اور حسنِ ادا ہے لیکن اسی کے ساتھ شکوہ ہائے روزگار ہیں، مشکلوں کا گلہ ہے، بڑھاپے اور ناداری کا رونا ہے اور ناقدری کا صدمہ ہے۔ اور رئیسوں اور امیروں کے درباروں سے توسط اور کچھ حصول کی کوششوں کے اذکار ہیں۔ دوسرے کے یہاں ادبی خوبیاں اور فنی لطافتیں پیدا کرنے کی کوشش کہیں نہیں، بڑی سیدھی سادی، بے تکلّف اور سچّی باتیں ہیں جو مکتوب نگار کے دل سے نکلتی ہیں اور قاری کے دل میں اتر جاتی ہیں۔ یہ خط اپنی بے پناہ سادگی اور بے تکلّف اندازِ بیان کے باوجود بڑے بڑے نکتے اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ یہ بقول کسی کے "سوانح نگاری کی جان" بھی ہیں اور ساتھ ہی اپنے دور کے حالات پر، اس زمانے کی رہن سہن، معاشرت وغیرہ پر اور بہت سے دوسرے مسائل پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔

حالؔی کے خطوں کے دو مجموعے مکتوباتِ حالؔی کے نام سے ۱۹۲۵ء میں حالؔی پریس پانی پت نے شائع کیے تھے جو اب دستیاب نہیں ہوتے۔ یہ مجموعے کئی لحاظ سے ناقص ہیں۔ اوّل تو ان کی کتابت بہت جلد بھجیا بن جاتی ہے۔ دوسرے مولانا حالؔی کے فرزندِ اصغر خواجہ سجاد حسین مرحوم نے ان خطوں میں جگہ جگہ ناموں اور واقعات کی جگہ نقطے لگا دیے ہیں۔ ان میں سے بعض واقعات اور نام ان لوگوں کے ہیں جو اس کی اشاعت کے وقت حیات تھے اور خواجہ سجاد حسین کو جو مروّت اور اخلاق میں بے مثال تھے، یہ گوارا نہ ہوا کہ کسی کا نام اس طرح آئے جس سے اسے کسی وجہ سے بھی شرمندگی یا سُبکی محسوس ہو۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں کا نام آیا ہے وہاں بھی لگا دیے گئے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب عورت کے نام پر غیروں کی نظر پڑنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ جگہ جگہ یہ نقطے پڑھنے والے کو الجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں اور بعض جگہ مطلب سمجھنے میں بھی دقّت ہوتی ہے۔ افسوس کی

بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں حالیؔ کے وطن کی تباہی کے وقت خواجہ سجاد حسین اور دوسرے سب عزیزوں کے گھر بار لٹنے کے ساتھ ساتھ سارا خاندانی ذخیرہ جس میں ہر قسم کے قلمی نسخے، بزرگوں کے ادبی تبرکات، تحریریں، خطوط سب ہی کچھ شامل تھے ضائع ہو گئے اور اب کوئی ذریعہ نہیں رہا کہ ان خطوط کے اس نقص کو پوری طرح سے دور کیا جا سکے۔

یہ مجموعہ اس لحاظ سے بھی تشنہ ہے کہ اس میں حالیؔ کے صرف آخر عمر کے خطوط ملتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے لوگ ان کے خط بھی جیسا کہ سب خطوط کے ساتھ ہوتا ہے، ضائع کر دیتے ہوں گے، جب ان کی ادبی شہرت بڑھی تب لوگوں نے اُن کے خطوط کو احتیاط سے رکھنا شروع کیا۔ البتہ حالیؔ کے بیٹے اور بھتیجے خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام کے خط ۱۸۸۷ء تک کے ملتے ہیں اور اس مجموعے میں زیادہ تر یہی خط پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر خطوں میں نجی اور خاندانی باتیں ہیں لیکن بہت سے خطوں میں مدرستہ العلوم علی گڑھ کے بارے میں اور دوسرے ملکی اور سیاسی مسائل کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ بہت سے دوسرے عزیزوں کے نام کے خط بھی ہیں۔ اور دوستوں، ہم عصر مشاہیر، اور عقیدت مند نوجوان ادیبوں کے نام کے بھی اکثر خط موجود ہیں۔ لیکن حالیؔ کے سب سے قریبی دوست اور مرشد غالبؔ اور سرسیّد کے نام خط نہیں اور یہ کمی بُری طرح کھٹکتی ہے۔ یقینِ غالب ہے کہ ان بزرگوں سے حالیؔ کی جو خط و کتابت ہوئی وہ کئی لحاظ سے بہت زیادہ اہم اور قابلِ قدر ہوگی۔ غالبؔ سے ادبی اور شعری نکات پر اکثر تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا، اور سرسیّدؔ سے تو ہر مسئلے ہی پر بات چیت اور خط و کتابت ہوتی تھی۔ لیکن افسوس کہ ان بزرگوں کے نام خطوط ضائع ہو گئے اور ادب کے شائقین کے ہاتھوں میں نہ پہنچ سکے۔ اور اب تو یہ مجموعہ بھی جیسا بھی چھپا تھا نایاب ہے۔ یہ اردو کے پرستاروں کی محرومی اور اردو کے سرپرستوں کی غفلت ہے کہ حالیؔ جیسے ادیب و شاعر اور عظیم شخصیت کے خطوط سے اردو ادب اب محروم ہے۔ البتہ حال میں مولوی اسمٰعیل پانی پتی کا چھپوایا ہوا ایک مجموعہ "مکاتیبِ حالیؔ" نظر سے گزرا۔ انھوں نے حالیؔ کے وہ خط جو پہلے مجموعے میں شامل نہیں تھے، جمع کر کے شائع کیے ہیں ان میں ایک سو گیارہ اردو کے خط ہیں اور ۲۸ خط فارسی اور عربی کے ہیں جن میں ایک

خط غالبؔ کے نام کا بھی موجود ہے۔

ہم نے گذشتہ بابوں میں حالیؔ کی زندگی کے واقعات، ان کے خیالات، ان کی شخصیت اور سیرت وغیرہ کے بیان میں اکثر ان کے خطوں کے ٹکڑے نقل کیے ہیں لیکن ان سے پوری طرح مکتوباتِ حالیؔ کی خصوصیات اور خوبی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان خطوط کے مجموعے کو پڑھنے سے ایک طرف حالیؔ کی زندگی کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے جو ان کے انکسار اور خود پوشی کی عادت کی بدولت لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے؛ دوسرے ان کی سیرت کے بہت سے ایسے گوشے اجاگر ہوتے ہیں جو اور کسی طرح نہیں ہو سکتے تھے۔

حالیؔ کا اندازِ تخاطب بہت سیدھا سادا ہے۔ وہ بزرگوں اور برابر والوں کو زیادہ تر "جنابِ من" یا "والا جناب"، "مخدومی"، "مکرمی" یا "مخدومی و مکرمی"، "برادر" وغیرہ سے مخاطب کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی طویل القاب بھی لکھ جاتے ہیں یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب محبت یا عقیدت کا جذبہ زیادہ گہرا ہو۔ جیسے "برادر محبت گستر مہر پرور سلامت" لیکن اس قسم کے القاب بہت کم ہیں۔ بیٹوں، بھانجوں، بھتیجوں، نواسوں، پوتوں وغیرہ کو "برخوردار" یا "برخوردار سعادت آثار" یا "برخوردار طول عمرہٗ" وغیرہ لکھتے ہیں۔ لڑکیوں سے محبت زیادہ ہے لہذا خطوں میں بھی اظہارِ محبت زیادہ نظر آتا ہے۔ "برخورداری نورچشمی" یا صرف "نورچشمی"۔ کبھی کبھی بچوں سے باتیں کرتے کرتے "میری جان" بھی لکھ جاتے ہیں۔ یہ گویا حالیؔ کے اظہارِ محبت کی انتہا ہے۔ ان کی محبت اور لگاؤ کا اندازہ الفاظ سے نہیں نفسِ مضمون اور اندازِ بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

صاحبِ علم و فضل حضرات کو خط لکھتے وقت بھی ان کے ہاں عربی فارسی کی آمیزش اور مشکل اور دقیق اندازِ بیان نہیں ہوتا، پھر بھی کہیں کہیں کوئی مشکل لفظ یا علمی انداز کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ لیکن جب اپنے سے چھوٹوں خصوصاً عورتوں اور بچوں کو خط لکھتے ہیں اس وقت تو ایسی سہل، رواں اور دلنشیں زبان ہوتی ہے جیسے کوئی بڑے پیار سے ان کی عقل اور معلومات کے مطابق ان سے باتیں کر رہا ہو۔ اپنے سے کم عمر ادیبوں اور شاعروں کا مولانا حالیؔ کو بڑا خیال رہتا تھا۔ وہ نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی اور تعریف

کرتے تھے بلکہ ان کی عزت اور احترام بھی بہت کرتے تھے۔ ان کے خطوط سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ بزرگوں اور برابر والوں کو جس طرح مخاطب کرتے ہیں، بعض اوقات اس سے بھی زیادہ احترام سے اپنے ان خوردوں سے خطاب کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کو (جن کو حالؔی سے بے پناہ عقیدت ہے اور مولانا کو بھی ان سے دلی تعلق تھا) اکثر مخدومی و مکرمی یا جناب مخدومی مولوی صاحب وغیرہ کے القاب سے سرفراز کرتے ہیں۔ ان کے بعض خط بغیر کسی القاب کے بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض میں کچھ تمہید ہوتی ہے لیکن اکثر میں القاب کے فوراً بعد نفسِ مضمون ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر مولوی عبدالحق کی اس رائے سے قاری کو متفق ہونا ہی پڑتا ہے جو انھوں نے حالؔی کے خطوں کے بارے میں لکھی ہے کہ :-

"خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردیِ بنی نوعِ انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنا چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔ . . . . ."

چند خط مشتے نمونہ از خروارے نقل کرتی ہوں جن سے آپ کچھ اندازہ لگا سکیں گے کہ حالؔی کا خط لکھنے کا کیا انداز تھا۔

یہ پہلا خط انھوں نے اپنی پوتی کے نام لکھا ہے۔ ذرا پڑھیے ایک ایک لفظ سے کیسی پدرانہ شفقت ٹپک رہی ہے :-

"برخورداری نورچشمی مشتاق فاطمہ طال عمرہا"

تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا جی بے حد خوش ہوا اور تمہاری پھوپی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم نے اتنی دور جاکر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھادی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت و سلامتی

کی دعا کرتی رہتی ہیں۔ تم مجھے صاف صاف لکھو کہ اس ملک کی آب و ہوا کا تم اپنے اوپر کیسا اثر پاتی ہو۔ امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازہ ہو کر آؤ کہ یہاں تمہیں کوئی نہ پہچان سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی مشتاقا ہوں۔ پرسوں احمد حسین کا ختنہ ہو گیا۔ تمہارے چچا بھی اس تقریب میں آئے تھے۔ آج اپنی بہن کو ساتھ لے کر دلی روانہ ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ عنایت[1] فاطمہ اپنی بھابی اور بھتیجوں کو ساتھ لے آویں گی ——— تمہاری امی جان[2] خدا کے فضل سے اچھی ہیں اور تمہیں ہر وقت یاد کرتی ہیں۔ مجھے فرصت کم ہوتی ہے اس سبب سے وہاں ہمیشہ نہیں جا سکتا۔ کبھی کبھی جاتا رہتا ہوں۔ تمہیں خط بھی اس سبب سے جلدی جلدی نہیں لکھ سکتا . . . . . . نے تمہارا پتا دریافت کیا تھا۔ میں نے اُسے لکھ بھیجا ہے۔ امید ہے کہ اس کا خط بھی تمہارے پاس ضرور پہنچے گا۔ ایک خط بھائی فیاض[3] حسین کے مکان کے پتے سے دادی بہو[4] کے نام بھی بھیجا اور اس میں یہ لکھا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔ روانگی کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی۔ لو بیٹا تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ اب پانچ سات دن بعد پھر خط لکھوں گا۔ زیادہ دعا۔

الطاف حسین۔ از پانی پت۔ ۱۲ر شوال ۱۳۱۶ھ

تمہاری دادی کے سوا اس وقت گھر میں کوئی نہیں تمہیں بہت بہت دعا دیتی ہیں۔ اور پیار کرتی ہیں اور بلائیں لیتی ہیں ——"

گھریلو محبت کی کیسی پیاری تصویر ہے! ان چند سطروں کو پڑھ کر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ نہ صرف حالؔی کو اپنی اس پوتی سے بے حد محبت ہے بلکہ سارا خاندان اس پر جان دیتا ہے۔ خاندان بھر کے حالات سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں مطلع کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی جو فروگذاشت

---

[1] حالؔی کی بیٹی [2] حالؔی کی بڑی بھاوج [3] حالؔی کے ماموں زاد بھائی اور سالے۔ [4] فیاض حسین صاحب کی دوسری بیوی۔

آتے وقت ہوگئی ہے، دھیمے اور محبت بھرے انداز میں اس کی طرف دھیان دلاتے اور اس کی تلافی کی صورت بتاتے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ ان "دادی بہو" سے سوتیلا رشتہ ہے اور حالؔی کو یہ خیال ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے دل میں یہ خیال ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ سوتیلا سمجھ کر جاتے وقت مشتاق فاطمہ مجھ سے نہیں ملی۔ عزیزوں کا جب ذکر کرتے ہیں تو محض نام لے کر نہیں بلکہ "بلکہ تمھارے چچا"، "تمھاری پھوپی"، "تمھاری دادی"، "تمھاری امی جان" تاکہ اس کے دل میں محبت اور خلوص کے جذبات اور زیادہ ابھریں۔

یہ دوسرا خط مولوی عبدالحق صاحب کے نام ہے۔ حالؔی کے ان خطوں کے مجموعے میں ان کے نام کے بہت سے خط ہیں جن میں علمی، ادبی، سیاسی، خاندانی اور ذاتی سب ہی معاملات پر گفتگو ہوتی ہے۔ اور اس زمانے کے بہت سے واقعات خصوصاً مدرستہ العلوم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی یہ پتا چلتا ہے کہ حالؔی کو اُن سے کس قدر اُنس و خلوص تھا۔

یہ خط ۱۹۱۳ء کا لکھا ہوا ہے جب مولانا چراغِ سحری تھے۔ مولوی عبدالحق مدت سے انھیں انتہائی اصرار سے بلا رہے تھے اور باوجود اس کے کہ حالؔی کا جی اورنگ آباد جانے کو چاہتا تھا مگر پیرانہ سالی اور بیماری کے باعث جانا نہ چاہتے تھے اس لیے کہ بقول خود ان کے "اس عمر میں کسی عزیز یا دوست کے پاس جا کر رہنا یا اس کو بیمار داری کی تکلیف دینی ہے یا تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے۔" اس بار مولوی صاحب کا اصرار اور زیادہ اس وجہ سے ہے کہ پانی پت میں پلیگ بہت زور سے پھیلا ہوا تھا۔ اس خط کا جواب دیکھیے:

پانی پت۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۱۳ء

جاں بر سرِ مکتوبِ تو از شوق فشاندن
از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

مولانا! عنایت نامے کے محبت آمیز الفاظ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ آپ نے جس موثر طریقے سے خاکسار کو بلایا ہے اس سے متاثر نہ ہونا درحقیقت ایک قسم کی ناشکری ہے۔

اگر اس وقت یہاں پلیگ کی گرم بازاری نہ ہوتی تو میں ضرور آپ کے حکم کی تعمیل کرتا مگر حمیت اجازت نہیں دیتی کہ سارے کنبے کو خوف و خطر کی حالت میں چھوڑ کر گھر سے بیک بینی و دو گوش نکل جاؤں۔ اس کے سوا جب آدمی کسی کام کا نہیں رہتا اور زندگی بے لطفی سے گزرنے لگتی ہے تو اس کو زیادہ جینے کی ہوس بھی نہیں رہتی۔ بایں ہمہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس موسم کے مع الخیر گزر جانے کے بعد بشرطِ حیات ایک بار اورنگ آباد آکر وہاں چند روز ضرور قیام کروں گا۔ معلوم نہیں کہ وہاں آم کا موسم مثل حیدر آباد کے گرمی میں ہوتا ہے یا ہندوستان کی طرح برسات میں ہوتا ہے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ آم کے موسم میں ادھر کا رُخ کیا جائے۔

سلسلہ معلوم تعلیمِ نسواں کے مصنّف کے متعلّق مجھے اس قدر تو بالیقین معلوم ہے کہ ان کا نام نواب احمد علی خاں مشہور ہے۔ نواب محبوب علی خاں خواجہ سرا جو بہادر شاہ مرحوم کی نامور بیگم زینت محل کے محلدار یعنی خواجہ سرا تھے، انھوں نے ایک شریف زادے کو متبنّٰی کر لیا تھا جس کا نام محمود علی خاں تھا۔ وہ مرزا جواں بخت مرحوم کے ہمعصر تھے اور انھیں کے ساتھ اکثر سوار ہوتے تھے۔ میں نے اُن کو بارہا دیکھا ہے۔ یہ نواب احمد علی خاں انھیں کے صاحبزادے ہیں۔ نواب محمود علی خاں نے غدر کے بعد اُن کو غالباً رڑکی میں یا لاہور میں ڈرائنگ وغیرہ کی کافی تعلیم دلوائی تھی اور خاندانِ شاہی کے متوسّل ہونے کے سبب اُن کو نواب لفٹیننٹ گورنر کے دفتر میں معقول جگہ مل گئی تھی۔ ظنِ غالب یہ ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور پنشن پاتے ہیں اور دہلی یا لاہور میں رہتے ہیں۔ عزیزی خان بہادر خواجہ تصدّق حسین ان کے مفصّل حالات سے واقف ہیں۔ اگر آپ کو مزید تحقیقات منظور ہو تو میں عزیزِ مذکور سے دریافت کر کے آپ کو لکھ بھیجوں۔ امید ہے کہ آپ بہمہ وجوہ بخیریت ہوں گے اور اپنے علمی مشغلے میں مصروف ہوں گے۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالؔی

اندازِ بیان سے کون سمجھ سکتا ہے کہ یہ اپنے سے ۲۵، ۳۰ برس چھوٹے کو لکھا جارہا

ہے۔ کہیں بزرگی کی دھونس، علمی برتری کا رعب نہیں بلکہ ایک ایک لفظ سے خلوص اور اُنسیت کی بُو آ رہی ہے۔ عبدالحق صاحب نے کسی صاحب کے بارے میں کچھ دریافت کیا ہے تو کس قدر تفصیل سے ان کے حالات معلوم کر کے لکھے ہیں مگر اس پر بس نہیں بلکہ آخر میں یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ اگر مزید حالات درکار ہوں تو میں تصدق حسین سے معلوم کر کے لکھ بھیجوں۔

اور پھر اس پیرانہ سالی میں آم کا شوق دیکھیے کہ اورنگ آباد آنا تو چاہتا ہوں، مگر ایسے موسم میں جب آم بھی کھا سکوں۔ اس میں اگر ایک طرف اپنے شوق کا اظہار ہے تو دوسری طرف دوست پر بے تکلفی کا اظہار اس کی یقین دہانی بھی کرنا چاہتے ہیں کہ میرا واقعی آنے کا قصد ہے۔

حالیؔ کے ایک دلّی کے دوست مولوی عبدالرحیم خاں بیدلؔ کے نام کا ایک خط پڑھیے۔ یہ صاحب فکرِ سخن کرتے تھے اور اپنا کلام حالیؔ کے پاس بھیجتے تھے۔ اس میں حالیؔ نے اپنے فکرِ سخن کا کچھ ذکر کیا ہے اور اپنی ایک جدید طرز کی غزل انھیں بھیجی ہے۔

" مخدومی۔ آپ کی غزلیں دیکھ کر ایک غزل میں نے بھی لکھی ہے۔ فصیح الملک[1] کی ایک غزل کبھی دیکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

کب تک کھنچے رہو گے کبتک تنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

مگر جب فکر کرنے لگا تو اس کی بحر یاد نہ رہی۔ دوسری بحر مگر اسی ردیف و قافیہ میں ایک دو شعر لکھے گئے۔ لاچار اسی بحر میں غزل پوری کرنی پڑی۔ عاشقانہ رنگ تو اب گویا بالکل چھوٹ ہی گیا ہے۔ اب تو اور ہی طرح کی بکواس ہوتی ہے جس پر یہ مثل صادق آتی ہے " خشکہ باگندہ بروزہ اگرچہ گندہ لیکن ایجاد بندہ " تنہائی میں آپ کا جی گھبراتا ہو گا اس

---

[1] داغؔ

لیے آپ کے شغلے کے لیے غزلِ مذکور ارسالِ خدمت کرتا ہوں۔ عزیزی خواجہ عبدالمجید خاں کو دعا و سلام۔

نہ[1] عیشِ کیخسروی رہے گا نہ صولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو! تو باقی دِیے کی کچھ روشنی رہے گی

رہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گے تارے تم آسماں کے
کسی کی آگے بنی رہی ہے، نہ اب تمھاری بنی رہے گی

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہ زن[2]
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہ زنی رہے گی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ہمیشہ ٹھنی رہے گی

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبولِ عام ہونا
رہو گے گر حُسنِ ظن کے طالب تو تم سے یاں بدظنی رہے گی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالیؔ تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیّت اُن کی غنی رہے گی[3]

خاکسار الطاف حسین۔ از پانی پت، ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء

عشقیہ شاعری کو حالیؔ نے جان بوجھ کر ترک کیا تھا۔ اور غزل میں دوسری قسم کے مضامین ارادتاً باندھتے تھے تاکہ نئی شاعری کا ایک نمونہ پیش کریں۔ لیکن ان کو احساس

---

[1] یونیورسٹی بل کی طرف اشارہ ہے۔

[2] مکتوباتِ حالیؔ میں اوپر کا فقرہ فٹ نوٹس میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خود حالیؔ نے اپنے خط میں لکھا تھا یا مرتب نے اپنی طرف سے بڑھایا ہے۔

[3] تین شعر اس غزل کے میں نے طوالت کے خیال سے حذف کر دیے ہیں۔

تھا کہ پرانے طرز کے دلدادہ اس سے بھڑکتے اور بگڑتے ہیں اس لیے وہ اکثر اپنی جدّت پسندی پر کبھی ہلکے سے طنزیہ انداز میں کبھی انکسار کے طور پر اور کبھی مزاحیہ رنگ میں فقرہ چُست کر جاتے ہیں۔ ایک اور چیز جو قابلِ ذکر ہے وہ حالؔی کا اپنی شان میں "گستاخی" کرنا ہے۔ ہمارے تجربہ کار اور پختہ کار شعرا ہی نہیں نوجوان اور نوسیکھیے تک اس کو برداشت نہیں کرسکتے کہ کسی دوسرے کا کیا ذکر ہے، وہ خود بھی اپنی "عظیم وبلند" "محترم اور معزز" ہستی کی شان میں سوے ادب کریں۔ بلکہ تعلّی اور اپنی تعریف کرنا شاعر کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حالؔی کبھی اپنی تعریف نہیں کرتے۔ کبھی کبھی بہت دھیرے سے نئی شاعری کی، جس کی لے سب سے پہلے انھوں نے بلند کی تھی اہمیت جتانے کے لیے کوئی ہلکا سا اشارہ ضرور کر دیتے ہیں جیسے ـــ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر　　شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ

اور اس غزل کا آخری شعر پڑھ کر میری نظروں میں حالؔی کے بیٹوں کی زندگی اور سیرت گھوم گئی۔ حالؔی کی اولاد میں ان کی بہت سی صفات موجود تھیں۔ خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجّاد حسین ادبی اور علمی ورثے میں سے اپنے باپ کے ہم پلّہ نہ تھے لیکن دوسری خوبیوں میں وہ ان کا ثانی تھے۔ خاص طور پر خواجہ سجّاد حسین کے لیے کہا جاتا تھا کہ وہ دوسرے حالؔی ہیں۔ اور یہ حالؔی کی تربیت کا فیض اور ان کی روح کا فیضان تھا کہ ان کے "وارث" ہمیشہ "غنی" رہے، غربت میں، تنگی میں، عُسرت میں ہر حالت میں خدا نے اُن کے دل میں وسعت ہاتھ میں فراخی اور نظر میں استغنا قائم رکھا۔

آخر میں حالؔی کا ایک غیر مطبوعہ خط نقل کرتی ہوں جو نواب وقار الملک کے نام ہے اور اُن کے صاحبزادے کی عنایت سے مجھے حاصل ہوسکا ہے۔ اس خط میں حالؔی نے مدرسۃ العلوم پر انگریزوں کے تسلّط کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی ہے اور شدّت سے اس کی مخالفت کی ہے۔ اُن کے اکثر دوسرے خطوں میں بھی اس مسئلے کا ذکر ملتا ہے:

"جنابِ مولوی صاحب مخدوم ومکرم دام مجدہم!

بعد تسلیم نیاز کے التماس یہ ہے کہ آپ جب بمبئی سے واپس تشریف لائے تو مجھے اس وقت تک مطلق خبر نہیں ہوئی جب تک آپ امروہہ کو روانہ نہیں ہوئے۔ میں ۲۵ نومبر سے یہاں مقیم ہوں مگر چونکہ اب دل بستگی کی کوئی صورت نہیں رہی اس لیے چند روز سے بہت دل برداشتہ ہو رہا ہوں غالباً مارچ کے اوائل میں یہاں سے چلا جاؤں۔ یہاں آئے ہوئے پونے تین مہینے کے قریب ہوگئے اس عرصے میں صرف دو تین مرتبہ سیّد صاحب کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں زیادہ تفصیل سے یہاں کے حالات لکھنا نہیں چاہتا صرف ایک ضروری امر سے آپ کو مطلع کرتا ہوں، کیونکہ آپ کو میں اس انسٹیٹیوشن کا سب سے زیادہ خیر خواہ سمجھتا ہوں۔ آج کل سرسیّد کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ کالج کو گورنمنٹ کے سپرد کر دیں مگر چونکہ ان کو یہ امید نہیں ہے کہ گورنمنٹ اس دردِ سر کو اپنے ذمّے لے اس لیے اب ان کا یہ ارادہ ہے کہ قانونِ ٹرسٹیان میں جو دفعات یورپین اسٹاف سے متعلق ہیں انھیں کچھ ترمیم کریں خصوصاً وہ دفعہ جس کا منشا یہ ہے کہ "کوئی یورپین افسر کسی خاص عہدے پر تقرر کی نسبت دعویٰ کرنے کا مجاز نہ ہوگا"۔ مطلب یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کو کسی یورپین افسر کے موقوف کرنے کا اختیار باقی نہ رہے۔

جس وقت میں نے ان کا یہ ارادہ سُنا اور یہ بھی سنا کہ ترمیم کا مسودہ تیار ہو رہا ہے میں مولوی مہدی علی خاں صاحب کے پاس گیا اور ان کو بھی اس تجویز کا سخت مخالف پایا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ بھی اس تجویز کو پسند نہ کریں گے۔ اگرچہ کوئی دفعہ یا ضمن ایسی نہیں ہوسکتی جس کی آئندہ ترمیم یا تنسیخ نہ ہوسکے لیکن یورپین اسٹاف کے اختیارات اور حقوق ایک بار اس قدر بڑھا کر پھر ان کو گھٹانا بہت مضر نتائج پیدا کرے گا۔ تمام حکمراں گروہ میں ناراضی پھیل جائے گی اور کالج کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا، اور کچھ عجب نہیں کہ موجودہ یورپین اسٹاف یک قلم کالج سے قطع تعلق کر دے۔ بہرحال مولوی مہدی علی خاں صاحب کی یہ رائے ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کا انسداد کیا جائے۔ وہ آپ کو خود

خط لکھنے والے تھے مگر ان کے ہاتھوں میں سرخ باد ے کا اس قدر زور ہے کہ دونوں ہاتھ گونڈھنی کی طرح پھل رہے ہیں اور نہایت تکلیف ہے۔ اس لیے وہ اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھ سکتے۔ ان کی یہ رائے ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ٹرسٹیوں کو اس ترمیم کے واقعی نتائج سے جو آئندہ یقیناً پیدا ہوں گے، اچھی طرح مطلع کیا جائے اور ان کو یہ بات بخوبی سوجھائی جائے کہ اگر یہ ترمیم پاس ہوگئی تو کالج مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ اگر ٹرسٹیوں کو پہلے سے مطلع نہ کیا جائے گا تو جو لوگ خالی الذہن ہیں، اور سر سید کی رائے پر ہر طرح کا وثوق رکھتے ہیں (اور دو چار کے سوا سب ایسے ہی ہیں) وہ آنکھ بند کر کے منظور کر لیں گے اور کثرتِ رائے سے ترمیم پاس ہو جائے گی۔ ضلع علی گڑھ کے ٹرسٹیوں کو تو محسن الملک سنبھال لیں گے مگر دکن وغیرہ میں آپ سلسلہ جنبانی کریں۔ میرے نزدیک تو مولوی عزیز مرزا کو اگر آپ لکھیں گے تو وہاں کے ٹرسٹیوں کو وہ اچھی طرح سمجھا دیں گے باقی اور ٹرسٹیوں کو علیحدہ لکھنا چاہیے۔

اگر آپ کا ارادہ اس طرح پر لوگوں کو پہلے سے مطلع کرنے کا ہو تو جتنے لوگوں کو آپ اطلاع دے سکیں ان کے نام سے مجھے یا محسن الملک کو اطلاع دیجیے تاکہ اور لوگوں کو دوسرے ذریعے سے مطلع کیا جائے۔ میری تحریر کی شاید کچھ وقعت نہ ہو ورنہ میں اس کام کو بسر و چشم کرتا۔ مگر محسن الملک کی طرف سے لکھنا شاید زیادہ موثر ہوگا۔ زیادہ نیاز۔ اس خط کو پڑھ کر چاک کر ڈالیے گا۔

خاکسار الطاف حسین حالی

از علی گڑھ۔ ۱۸ فروری ۹۸ء

معلوم ہوتا ہے کہ نواب وقار الملک کو اپنے محترم دوست کی تحریریں بہت عزیز تھیں اور وہ اس خط کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے تب ہی تو انھوں نے حالی کی ہدایت کے باوجود خط کو ضائع نہیں کیا اور آج ۵۸ برس بعد یہ خط ہم تک پہنچ گیا۔ سر سید، حالی اور مدرسۃ العلوم کے تعلق پر ہم پچھلے بابوں میں لکھ چکے ہیں۔ اس خط سے حالی کے ان خیالات پر مزید روشنی پڑتی ہے جو ان کے مدرسے کو انگریزوں کے سپرد کرنے کے بارے میں تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے

کہ سر سید اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس دھن میں اس قدر محو تھے کہ اپنے دیرینہ رفیقوں اور دوستوں سے شاید ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ "یہاں آئے ہوئے پونے تین مہینے کے قریب ہو گئے اس عرصے میں صرف دو تین دفعہ سید صاحب کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔" یہ محض "اتفاق" نہیں معلوم ہوتا۔ شاید سر سید کو حالی کی رائے معلوم تھی کہ وہ علی گڑھ میں انگریزوں کے تسلّط کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اسی وجہ سے ان سے ملنا جلنا کم کر دیا ہو۔ ورنہ حالی کے قلم سے جو سر سید کے دل سے معتقد اور برسوں پرانے رفیق، مدرسے کے عاشق اور علی گڑھ کے دلدادہ تھے یہ جملہ نہ نکلتا کہ "چند روز سے بہت دل برداشتہ ہو رہا ہوں۔" اس خط میں حالی نے اگرچہ بہت متانت اور نہایت اختصار سے سر سید کا ارادہ اور خیال لکھا ہے مگر اتنی کڑی تنقید اور مخالفت کسی اور خط یا تحریر میں نہیں ملتی۔ غالبًا اسی خط کی طرف نواب وقار الملک نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر چند روز ہی بعد سر سید کا انتقال نہ ہو جاتا تو حالی کھلم کھلا ان کی اس تجویز کے خلاف میدان میں آ جاتے۔ لیکن جب سر سید کا انتقال ہو گیا تو حالی کے دل پر دوست کی جدائی اور مسلمانوں کے رہنما کی موت کا بہت گہرا اثر ہوا۔ ظاہر ہے ان کی کمزوریاں، جن کے مقابلے میں ان کی صفات اور خدمات کہیں زیادہ بھاری ہیں، ان کو اتنی اہم معلوم نہیں ہوئیں کہ ان کا مفصّل ذکر کرتے حالی "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کے قائل معلوم ہوتے ہیں پھر بھی انھوں نے ان باتوں کی طرف اشارے ضرور کیے ہیں۔ لیکن خطوں سے ان کی رائے ان معاملات میں جتنی صاف اور واضح معلوم ہو سکی، وہ اور کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی۔

خط انسان کی شخصیت کا چربہ اور سیرت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ خصوصًا حالی کے خطوط جن کا اندازِ بیان سیدھا سادا بے تکلّف اور تصنّع اور آورد سے پاک ہے، اس کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ وہ کوشش کر کے اپنے خطوط میں ادبی خوبیاں اور انشا پردازی کا حُسن پیدا نہیں کرتے۔ ہاں جہاں بے تکلّف اور بے ارادے کوئی حسین جملہ یا دلکش ٹکڑا قلم سے نکل جائے وہ نکل جائے۔

حالی کی دوسری تحریروں میں بھی اگرچہ اندازِ بیان بہت رواں، سلیس اور دل نشیں ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی ان میں علمی رنگ اور فارسی و عربی کی آمیزش مل جاتی ہے۔ لیکن ان سات سو پچاس خطوط کے مجموعے میں مشکل سے کوئی خط ایسا ملتا ہے جس میں مشکل اندازِ بیان یا آورد و تصنع پایا جائے۔ نہایت بے تکلف روزمرّہ اور بامحاورہ زبان میں وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں سے باتیں کرتے ہیں لیکن ان سیدھے سادے جملوں میں بڑی بڑی گُر کی باتیں موجود ہیں اور یہ خط اس زمانے کے حالات و واقعات، رہن سہن، خیالات اور طرزِ فکر پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور حالی کی جو تصویر ہم سنے سنائے واقعات اور ان کے قلمی کارناموں سے اپنے ذہن میں بناتے ہیں، اس میں یہ خطوط بڑے واضح اور روشن رنگ بھر دیتے ہیں۔ حالی کا دردمند دل، محبّت بھرا چہرہ، وسیع دماغ، گہری و سنجیدہ آنکھیں، متوازن شخصیت، اور دلکش سیرت ان خطوں کی ہر ہر سطر سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے جو حالی کی عظیم شخصیت کو ہمارے لیے اور زیادہ محترم اور محبوب بنا دیتی ہے۔

حالی کی دریافت - غالب

یہ جو پہلے خیال تھا کہ غالب کی زندگی میں ان کی قدر اور ان کے کلام کی پذیرائی نہیں ہوئی، صحیح نہیں ہے۔ دراصل خود غالب کو یہ دکھ تھا اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے، اسی سے یہ بات مشہور ہو گئی۔ محققِ غالب مالک رام صاحب کا یہ کہنا اس کی سند ہے کہ "اس کا اردو دیوان اس کی زندگی میں پانچ مرتبہ شائع ہوا اور ان میں سے آخری تین اشاعتیں تو یکے بعد دیگرے کوئی دو سال میں منظرِ عام پر آئیں اور ان کے علاوہ ایک مرتبہ تقریباً پورا دیوان ایک انتخاب میں شامل کیا گیا۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ اس کے معاصرین میں بیشتر اصحاب کے دیوان ان کی زندگی میں ایک مرتبہ بھی نہیں چھپ سکے۔۔۔۔" [1]

کسی فنکار کی اُس وقت کیا آج بھی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے فن کی قدر ہو، کلام شائع ہو اور بار بار شائع ہو اور اس کی شہرت پھیلے۔ پھر غالب کیوں شاکی تھے؟ اس لیے کہ وہ اپنے کو اس سے کہیں زیادہ شہرت اور قدر کا اہل سمجھتے تھے (اور صحیح سمجھتے تھے) ان کی شہرت و مقبولیت ایک خاص حلقے میں ضرور تھی، یہ حلقہ پڑھے لکھوں کا، ان کے احباب کا اور چند قدردانوں کا تھا۔ غالب اس سے مطمئن نہ تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی

---

[1] "عیارِ غالب" از مالک رام، ص ۲۶۰

قدر دانی کا عملی اظہار بھی ہو۔ رئیس، امیر، بادشاہ اور بعد میں انگریزی حکومت اس کا اعتراف کرے۔ اور زمانے کے حالات سے مجبور وہ اس کے لیے جو کوشش کرتے رہتے تھے اس کے تذکرے کی ضرورت نہیں، اس پر خود غالبؔ کے خطوط اور دوسروں کی تحقیق موجود ہے۔ کہنا یہ تھا کہ اگرچہ غالبؔ کی ان کے زمانے میں قدر بھی ہوئی اور کلام کی پذیرائی بھی مگر اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیے تھی۔ اور بعد میں ان کی شہرت، ہر دلعزیزی اور ان کے کلام کی مقبولیت کا جو عظیم مینار تعمیر ہوا وہ اس کا ثبوت ہے کہ غالبؔ اپنا صحیح مقام سمجھتے تھے اور وہاں تک پہنچ نہ ہو سکنے کا ان کو قلق تھا۔ اس مقام کو پہچاننے اور پہچنوانے کا بڑا کام کیا ان کے شاگرد، دوست، مدّاح اور پرستار حالیؔ نے!

بظاہر مولانا الطاف حسین حالیؔ اور مرزا نوشہ غالبؔ میں بہت کم مشابہت نظر آتی ہے۔ غالبؔ پوتڑوں کے رئیس، آبائی پیشہ سپہ گری، نازک مزاج، بلند مرتبہ مشہور شاعر، شراب کے عادی، جوے کے شوقین، عاشق مزاج، زندگی اور زندگی کے مصائب سے بیزار، ناقدریِ زمانہ سے دل برداشتہ، خود دار اور غیور۔ مگر امرا، روسا اور حاکموں کے سامنے دستِ طلب دراز کرنے پر مجبور۔ اپنے بلند مقام سے ضرورت سے زیادہ مرعوب اور انانیت سے یوں چور کر اپنے سوا کسی دوسرے کو شاعر ماننے پر ہی تیار نہ تھے زیادہ سے زیادہ اردو شاعری میں انھیں ڈھائی شاعر نظر آئے۔ عقائد غالی شیعہ کے، شوہر سنّی بیوی کے۔ مذہب کے ظواہر سے بے گانہ و بے تعلق!

اور حالیؔ؟

متوسط زمیندار گھرانے کے چھوٹے بیٹے۔ شروع زندگی تنگی و ترشی اور تکلیف میں گزاری۔ کسبِ علم کی خاطر جگہ جگہ کی خاک چھانی چار برس کی عمر سے لے کر آخر تک جس استاد یا جس شخصیت سے فائدہ اٹھایا اس کا دل کھول کر اعتراف کیا احسان مانا۔ منکسر المزاج، محنتی، جفاکش، کبھی زمانے کا گلہ نہ کیا نہ ناقدری کی شکایت۔ عیش و آرام کیا آسائش کی زندگی کی بھی تمنّا نہ کی۔ عمر بھر قلم کی مزدوری، علم و ادب، شعر و سخن کی خدمت کی مگر کبھی اپنے کو بہت بڑا فن کار، بڑا شاعر یا ادیب ماننے یا منوانے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ سخاوت اور فیاضی کا یہ حال کہ فقیری میں تونگری کا جلوہ دکھاتے رہے۔ استغنا ایسا کہ کسی حال میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ حسنِ طلب تک کہیں نظر نہیں آتا۔ کسی کے سامنے سر نہیں

جھکایا۔ اور اگر کسی نے ذرا سا احسان کیا تو اس کا اعتراف کھلے دل سے کیا۔ حکومت نے شمس العلما کا خطاب دیا تو اسے انکسار کے ساتھ قبول کیا۔ اگرچہ اس سے انھیں الجھن ہوئی مگر یہ نہیں کہا کہ یہ میری شان کے خلاف ہے۔ قناعت کا یہ عالم کہ حیدرآباد سے پچھتر روپیے وظیفہ ہوا تو عربک کالج کی ملازمت ترک کر دی کہ علم کی خدمت کے لیے وظیفہ ملا ہے اس لیے سارا وقت اسی میں صرف ہونا چاہیے۔ اور پھر کٹر مذہبی (زمانے کے گزرنے کے ساتھ کٹرپن ختم مگر گہری مذہبیت باقی رہی) اسلام کے ظاہری احکام کے سختی سے پابند۔ شراب سے متنفر، جوے کے نام سے لرزاں، عشق بازی سے عاری (اگرچہ بقول خود ان کے، شاعری کی بدولت جھوٹا عاشق بننا پڑا) پاک دل، پاک باز، پاک صفات!—
ایک بات اور خود خوش عقیدہ سنّی اور شیعہ بیوی کے شوہر۔

ان دونوں شخصیتوں کی سیرت کا یہ تضاد کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ اس سے میرا مقصد نہ حالیؔ کی عظمت کا اظہار ہے (جو اظہر من الشمس ہے) اور نہ معاذ اللہ غالبؔ کی سیرت پر اعتراض کہ وہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بہت عظیم ہیں اور ہمیں بے حد محبوب!

تو پھر ان میں کیا قدرِ مشترک ہے؟ کچھ تو ضرور ہوگی ناکہ ان دونوں میں اتنی محبت، اتنا خلوص، اتنی دوستی تھی۔

حالیؔ جب غالبؔ سے پہلے پہل ملے تو سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان تھے جنھوں نے ابھی زندگی شروع ہی کی تھی۔ مسجد میں رہنے والے ایک مفلوک الحال طالب علم۔ اور غالبؔ عمر میں ان سے چالیس سال بڑے، جانے مانے مشہور شاعر، دلی بھر میں ان کی شہرت تھی۔ کیا دیکھا غالبؔ نے اس نو عمر لڑکے میں کہ ان جیسا انسان اسے کلام کے نکات و رموز سمجھانے پر تیار ہو گیا۔ حالیؔ نے خود کہا ہے

شعر میں ناتمام ہے حالیؔ غزل اس کی بنائے گا اب کون؟

کیا دیکھا انھوں نے کہ وہ جو کسی کو فکرِ سخن کی رائے نہیں دیا کرتے تھے اس کی غزلیں اور شعر سن کر بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے "مگر تمھارے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے"۔ کون جانتا تھا کہ غالبؔ کے ان دو جملوں نے حالیؔ کے دل میں شعر گوئی کا کیسا بے پناہ اور بے مثل جذبہ پیدا کر دیا جس نے آگے چل کر ان سے مرثیۂ غالبؔ، بیوہ کی مناجات، مسدسِ حالیؔ

جیسی عظیم نظمیں تخلیق کرائیں۔ اگرچہ غزل میں وہ غالبؔ کے پایے تک نہیں پہنچ سکے، شاید اس لیے کہ خدا کو ان سے وہ چیزیں لکھوانی تھیں جو غالبؔ بھی نہ لکھ سکتے تھے۔

حالیؔ اور غالبؔ کے تعلقات دس بارہ سال تک رہے اور غالبؔ اس نوجوان سے جس محبت، عزت، برابری سے ملتے تھے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان دونوں میں کوئی بہت گہری مماثلت اور دلی تعلق تھا۔

اس کے ثبوت میں اس واقعے کا ذرا سا تذکرہ کروں گی جو حالیؔ نے یادگار میں بڑے دکھ اور شرم کے ساتھ لکھا ہے اور اسی سے اُن دونوں کی سیرت پر اور گہرے مراسم پر روشنی پڑتی ہے۔ حالی نوجوان تھے اور سخت قسم کے مذہبی۔ بقول خود اُن کے؛ "یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے صرف اہلِ سنت کو اور اہلِ سنت میں سے صرف حنفیہ کو، ان میں سے بھی صرف ان لوگوں کو مغفرت کے لائق جانتے تھے جو ......" یعنی جو نماز روزے اور شریعت کے احکام کے پابند ہوں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: "جس قدر کسی سے لگاؤ زیادہ ہوتا جاتا اسی قدر زیادہ تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات و مغفرت کے لیے ناگزیر ہے۔ چونکہ مرزا سے محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لیے ہمیشہ اُن کی حالت پر افسوس ہوتا تھا گویا سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا ان کا ساتھ چھوٹ جائے گا ......" اس لمبے خط اور لکچر کا مضمون، غالبؔ کی شکایت، پھر اس کے جواب میں ان کا قطعہ، پھر حالیؔ کا قطعہ اور پھر غالبؔ کا قطعہ۔ خاصا لمبا افسانہ ہے اس کو چھوڑتی ہوں۔ صرف غالبؔ کے اس قطعے کے چند شعر سن لیجیے جو انھوں نے بالواسطہ حالیؔ کے لیے شیفتہؔ کو لکھ کر بھیجا تھا:

تو اے کہ شیفتہؔ و حسرتیؔ لقب داری
ہمی بلطفِ تو خود را، امیدوار کنم

چو حالیؔ از منِ آشفتہ بے سبب رنجید
تو گر شفیع نہ گردی، بگو، چہ کار کنم

دوبارہ عمر دہندم اگر بہ فرضِ محال
بر آں سرم کہ درآں عمر، ایں دو کار کنم
یکے ادائے عباداتِ عمرِ پیشینہ
دگر بہ پیشِ گہہ حالیؔ اعتذار کنم

اس کے جواب میں حالیؔ نے پھر ایک معذرت کا قطعہ لکھا تو غالبؔ نے لکھ کر بھیج دیا کہ "بس بابا بیت بخشیں موقوف۔"

اس سے ان دونوں کی محبت اور خلوص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالیؔ کو غالبؔ سے شروع ہی سے غایت درجہ محبت تھی۔ انھوں نے بہت عرصے بعد جو شعر سرسیّد کے لیے کہا تھا حقیقت میں وہ ان سے بھی زیادہ غالبؔ کے لیے پورا اترتا ہے:

آں دل کہ رم نمودے، از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے، بُردش بیک نگاہے

وہ اپنے اس بزرگ دوست اور استاد سے، جس کو نصیحت کرنے تک کا حوصلہ رکھتے تھے کس حد تک چاہتے اور کتنی اچھی طرح جانتے تھے؟ اس کا پہلا اظہار اس سخت صدمے کی حالت میں ہوتا ہے جب مرزا غالبؔ دنیا سے سدھار گئے۔

مرثیۂ غالبؔ جواز دو ادب کا شہ پارہ ہے، عقیدت و محبت کے علاوہ غالبؔ کی سیرت کا آئینہ بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین: اس میں ـــ "غالبؔ کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصور انسانیت کا تھا اس کی جھلک انھیں غالبؔ کی ذات میں نظر آئی اور اسے انھوں نے شعر کا جامہ پہنا کر شہرتِ دوام بخشی؛

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیِ لفظِ آدمیت تھا

یہ شعر ایک قصیدے سے کم نہیں ......"

غالبؔ کی شخصیت کی پہلی دریافت مرثیۂ غالبؔ میں ہی کی گئی۔ صرف چند شعر جن میں غالبؔ کی سیرت کا جلوہ نظر آتا ہے سن لیجیے:

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات　　　جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس　　　پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج　　　رند اور مرجعِ کرام و ثقات
لاکھ مضمون اس کا ایک ٹھٹول　　　سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

اور ——

بے صلہ مدح، شعر بے تحسیں　　　سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذرِ سائل تھی جان تک لیکن　　　درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی　　　سربلندوں سے انکسار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے　　　زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

خاصا طویل مرثیہ ہے جس کا ایک ایک شعر دل سے نکلا ہے اور دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ یہ دراصل پہلی جھلک ہے غالبؔ کی دلکش سیرت کی۔ اس میں اور یادگار غالب کی سیرت کے حصے میں اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ یہ سخت صدمے کی حالت میں نکلی دل کی بے ساختہ آواز ہے اور یادگارِ غالب بیس سال بعد لکھی گئی ہے جس میں غالبؔ کی سیرت کی خوبیوں اور صفات کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی جس نے دنیا سے غالبؔ کو منوایا! وہ جانتے تھے کہ غالبؔ کی شخصیت کو، ان کے مرتبہ شاعری کو، ان کے شعروں کے حسن و خوبی کو سمجھنے اور سمجھانے کی اشد ضرورت ہے اور باوجود بے حد منکسر المزاج ہونے کے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ کام اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہ صرف خود حالیؔ ہیں۔

یادگار غالبؔ کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ اسّی برس سے زیادہ سے یہ کتاب اردو ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کی افادیت اور ادب میں اس کے بلند مقام کو سبھی نے تسلیم کیا ہے۔ یادگار غالب کے بعد سے غالب شناسی کا وہ دور شروع ہوا جو اَب عروج کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگرچہ حالیؔ نے غالبؔ کی اردو اور فارسی کی شاعری پر کھل کر اور ڈوب کر بحث کی ہے اور اس کو لوگوں میں مقبول بنانے میں ان کا بڑا حصّہ ہے مگر اس کو تو دیر سویر دنیا کے

سامنے آنا ہی تھا۔ خراجِ تحسین پانا ہی تھا۔ صاحبانِ ذوق کی کمی نہیں تھی۔ اگر حالیؔ یہ کام نہ بھی کرتے تو دیر سے سہی دوسرے لوگ کرتے۔ ویسے بھی جیسا میں نے کہا غالبؔ کی زندگی میں بھی ان کا کلام کئی بار چھپ چکا تھا اور بہت سے لوگ اس کے دلدادہ تھے۔

لیکن غالبؔ کی شخصیت اور سیرت کو حالیؔ کے بعد سمجھنے والے نہ ملے۔ دراصل متنازعہ فیہ ان کی شاعری سے بہت زیادہ ان کی شخصیت تھی۔ ان کے مخالفوں اور دشمنوں کو ان کی شاعری سے اتنا سروکار نہ تھا۔ وہ تو ان کی ذاتی کمزوریوں کو اچھالتے اور غالبؔ کو بدنام کرتے تھے۔ گالیاں تک دیتے تھے! یہ ہم سب بھی جانتے ہیں کہ غالبؔ امیرزادے تھے اور امیرزادوں کی کمزوریاں ان میں موجود تھیں۔ اس وقت ایک طبقے کو چھوڑ کر یہ خامیاں بہرحال برائی سمجھی جاتی تھیں۔ خود کرنے والا بھی ان پر فخر نہیں کرتا تھا بلکہ عیب کو عیب ہی سمجھتا تھا (اب تو خیر قدریں ہی بدل گئی ہیں۔ عیب ہُنر اور ہُنر عیب گنے جانے لگے ہیں) مگر غالبؔ چھُپ کر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ حالیؔ لکھتے ہیں "مرزا کی راست بازی کا سبب یہ تھا کہ وہ کوئی کام چھُپا کر نہیں کرتے تھے جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا، جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں کرتے تھے۔ پس ان میں اگر کوئی عیب تھا تو وہی تھا جس کو ہر کس و ناکس جانتا تھا۔ مخفی عیبوں سے بالکل پاک تھے۔۔۔۔" مگر دنیا تو ظاہر پر حکم لگاتی اور اندر کی باتوں سے چشم پوشی کرتی ہے۔ غالبؔ کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ خود اپنے عیبوں کو سمجھتے اور (مزاحیہ فقروں کا ذکر نہیں) اس پر شرمندہ بھی تھے —— جہاں کہیں انھوں نے اپنے عقائد کا ذکر کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ سچّے موحّد تھے صوفی منش انسان تھے۔ خود ان کے الفاظ حالیؔ نے لکھے ہیں۔۔۔۔ "لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحّد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ، لا موجود الّا اللہ، لامؤثّر فی الوجود الّا اللہ۔" جناب رسالت مآبؐ سے ان کو گہری عقیدت و محبت تھی۔ ان کے فارسی کلام میں رسالت مآبؐ کی شان میں متعدد قصیدے وغیرہ موجود ہیں۔ اور جناب علی مرتضےٰ کے تو وہ عاشق تھے۔ ایسے کہ غالی شیعہ مشہور ہو گئے تھے۔ بعض وقت مصلحت کی وجہ سے وہ اس سے انکار کر جاتے ہوں مگر سب ہی جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ وہ حضرت علی کو جنابِ رسولِ خدا کے بعد سب سے افضل مانتے اور انھیں اپنا قبلہ، دیدہ و دل سمجھتے تھے۔

یہ تھا غالبؔ کا مذہب اور عقیدہ۔

حالیؔ نے پہلے مرثیۂ غالبؔ میں ان کی یہ جھلک دکھائی۔ پھر یادگارِ غالبؔ میں تفصیل سے ان کی سیرت اور اخلاق پر روشنی ڈالی کہ وہ سمجھتے تھے کہ صرف شعر و سخن سے بات نہ بننے کی۔ نثر میں بھی انھیں غالب کی ان صفات کو دنیا کو دکھانا چاہیے کہ ان کی سیرت کے صحیح خد و خال نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔ اور اس طرح عام طور پر لوگوں کو جو اُن کے بارے میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں۔

اس غالبؔ کو حالی ہی نے دریافت کیا اور لوگوں سے ملایا۔

مرزا غالبؔ کی کن صفات کو حالیؔ نے اجاگر کیا اور اس کے وہ ثبوت پیش کیے جن کی تردید نہیں کی جا سکتی تھی۔ مبالغہ یا عقیدت کہہ کر نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ صرف وہ عنوانات سن لیجیے جن میں فنِ شعر اور علم و ادب کا نہیں، صرف صفات و اخلاق کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ تصوف ۲۔ وسعتِ اخلاق ۳۔ مروّت ۴۔ حسنِ بیان ظرافت ۵۔ خودداری ۶۔ اسلام کا یقین ۷۔ فراخ حوصلگی ۸۔ شعر فہمی ۹۔ سخن سنجی ۱۰۔ کتاب فہمی ۱۱۔ شوخیِ بیان ۱۲۔ سلامتیِ طبع ۱۳۔ حق پسندی ۱۴۔ راست گفتاری ۱۵۔ سخن فہموں کی قدر وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر عنوان کے تحت ان کی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں اور ان کے کردار و سیرت پر روشنی ڈالی ہے۔

مرزا غالبؔ فیاض تھے، دلِ دردمند رکھتے تھے۔ ان کی زبان سے تو اس کا ذکر ہم نے سنا اور پڑھا ہی ہے۔ اب حالیؔ کی زبانی سنیے جس سے ان کی فیاضی کا اور زیادہ اندازہ ہوتا ہے۔

"سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لولے، لنگڑے اور اپاہج مرد اور عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے...... وہ غریبوں محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے....."

غالبؔ کی شوخی اور ظرافت ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے اور خطوط میں بھی۔ لیکن اس کو سب سے پہلے حالیؔ ہی نے پہچانا، پرکھا اور سراہا۔ ظرافت ایک ایسی صفت ہے جس میں ذرا پاؤں ڈگا اور آپ شے لطیف کے چشمۂ حیواں سے پھکڑپن کے ظلمات میں جا گرے۔ سچی سنس آف ہیومر

بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اور اس سے بھی کم لوگ اس کو پرکھ پاتے اور لطف اٹھا سکتے ہیں۔ غالبؔ کے احساسِ ظرافت کو حالیؔ جیسے متین، سنجیدہ اور بقول لوگوں کے زاہدِ خشک نے پرکھا اور اس سے محظوظ ہوا۔ یہاں تک کہ غالبؔ کو حیوانِ ظریف کا خطاب دے ڈالا۔ ان کے جو جو لطیفے اور قصّے اور فقرے انھوں نے بیان کیے ہیں اس میں دو چار کو چھوڑ کر سبھی ظرافت کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ظرافت اور شوخیِ طبع کی وجہ سے بھی غالبؔ کی محبوبیت میں اضافہ ہوا ہے اس لیے ثبوت کی ضرورت نہیں۔

غالبؔ کی زندگی کا سب سے المناک واقعہ جس سے انھیں سخت دکھ پہنچا ان کی قید کا معاملہ ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس سلسلے میں بھی سنس آف ہیومر کے کرشمے دکھائے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا انھیں سخت صدمہ پہنچا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ کیوں اور کس کی دشمنی کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا مگر بہر حال آیا۔ حالیؔ کے دل پر اس کا کیا اثر ہونا چاہیے تھا؟ ثقہ پرہیزگار حالیؔ کو تو اس پر سخت تنقید کرنا اور غالبؔ کی بڑی خامی بتانا چاہیے تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حالیؔ نے نہ تو اس کو چھپایا نہ اس پر سخت تنقید کی۔ بلکہ نرمی اور دل سوزی سے یوں اس واقعے کو پیش کیا کہ صداقت کا دامن بھی نہ چھوٹے اور غالبؔ کی سیرت پر بھی حرف نہ آئے: کہ حالیؔ برائی سے نفرت کرتے تھے، بُرے سے نہیں۔ ذرا اندازِ بیاں پر غور کیجیے: "مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔" پھر وہ سارا واقعہ جو معروف ہے بیان کر کے لکھتے ہیں: "اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے ان کے قید خانے میں گزرے، ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے، کھانا، کپڑا اور عام ضروریات حسب دل خواہ گھر سے ان کے لیے پہنچتی تھیں...... اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیل خانے میں رہتے تھے۔ مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفا اور اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہ دیکھا تھا اس لیے اسے وہ بہت بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے"...... وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال وہ دل برداشتہ وہاں سے بھی واپس نہ آئے بلکہ کسی کے سوال کے جواب میں کہا

تو یہ کر دا" پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں" اس لیے کہ وہ میاں کالے کی حویلی میں ٹھیرے ہوئے تھے۔

قدیم دلی کالج میں غالبؔ کو فارسی مدرّس کے انٹرویو کے لیے بلایا گیا، وہ اپنی پوری شان و شوکت سے، پالکی میں سوار ہو کر گورنر کے بنگلے پر پہنچے اور اس کا اپنی پیشوائی کے لیے انتظار کرتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد جب وہ آیا اور اس نے نہ آنے کی وجہ بیان کی تو وہ یہ تاریخی جملہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ "گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے"۔

حالیؔ نے اس واقعے کو تفصیل سے لکھا اور مرزا کی ستائش کی ہے۔ اور ویسے بھی اسے مرزا کی عظمت اور خود داری کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتی کہ غالبؔ کا کبھی بھی سنجیدگی سے مدرّسی کرنے یا لونڈے پڑھانے کا ارادہ ہوگا۔ وہ کہاں اور یہ وبال کہاں؟ لوگوں کے کہنے سننے یا گورنمنٹ انگریزی کی ملازمت کے چارم میں چلے تو گئے مگر شاید راستے بھر یہی سوچتے گئے ہوں کہ کس طرح اس وبال سے چھٹکارا حاصل کریں۔ عین وقت پر حاضر دماغی کام آئی اور خوش و خرّم گھر واپس آ گئے۔ ورنہ جب دیر سویر گورنر ان کو لینے آ ہی گیا تھا اور ملازمت کرنی ہی تھی تو دو ٹوک جواب دے کر واپس آنا کیا معنی؟

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عرصے بعد اسی کالج میں حالی کو جب عربی فارسی کے استاد کی جگہ پیش کی گئی تو انھوں نے ممنونیت اور انکسار کے ساتھ اسے قبول کیا اور برسوں وہاں درس و تدریس کے موتی لٹاتے رہے۔ اس لیے کہ حالیؔ معلّم تھے، مزدور تھے۔ خادم تھے قوم کے۔ آرام طلب رئیس زادہ نہ تھے نہ کسی بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ جسے خود پر اعتماد ہوتا ہے وہ عزّ کو نہیں آزماتا۔

مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ عرض تو صرف یہ کرنا تھا کہ حالیؔ نے جب غالب کو دریافت کیا تو ان کی سیرت اور شخصیت کو نسبتاً مختصر طور پر مگر بڑی سچائی، سادگی اور پرکاری کے ساتھ پیش کیا کہ دل کش، دل چسپ انسانیت سے بھرپور تصویر جس میں دردمندی کے رنگ، خدا پرستی کا

حسن بھی جلوہ گر تھا اور زندگی کے نشیب و فراز بھی نظر آتے تھے، یوں پیش کی کہ لوگوں کے دلوں میں اتر تی چلی گئی انھوں نے بتایا کہ انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ پلڑا کس طرف جھکتا ہے اور یقیناً غالبؔ کی خوبیوں کا پلڑا بہت جھکا ہوا ہے۔

اگر ہم خود حالیؔ کی سیرت اور شخصیت پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ انھوں نے غالبؔ کی جو صفات دکھائی ہیں، وہ خود ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ شوخیِ گفتار۔ اگرچہ لے دھیمی ہے۔ اخلاق کی بلندی۔ جس پر مجھے کہنے دیجیے کہ آج تک کوئی شاعر نہیں پہنچا۔ خود داری کہ زندگی میں کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ قناعت کہ روکھی سوکھی پر بسر کی۔ سخاوت کہ فقیری میں شاہی کی اور یوں کہ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے کو خبر نہ ہونے دی۔ خدا پرستی، مذہب سے شیفتگی ایسی کہ باطن کے نور سے سینہ روشن اور ظاہری احکام و فرائض سے چہرہ منور! عقیدہ یہ کہ ؎

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

دوسرے کی ان ہی صفات کی انسان سچی قدر کر سکتا ہے جن کی خو اس کے دل میں عظمت ہو اور جو خود اس کی ذات میں موجود ہوں۔ انھوں نے اپنے محترم استاد، محبوب دوست مرزا غالبؔ میں ان صفات کا جلوہ دیکھا تھا، ان کی قدر کی تھی، ان سے متاثر ہوئے تھے۔ اور ان کا یہی مقصد تھا کہ اصل غالبؔ سے دنیا متعارف ہو۔ آج مداح کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں مگر ان کے محبوب کا رخ روشن تابناک سے تابناک تر ہوتا جاتا ہے۔ اور اس چہرے کو دیکھیے جو دوسرا چہرہ ہے، وہ کم روشن اور تابناک نہیں ۔

پھر میں کہوں گی کہ غالبؔ کا شاعرانہ کمال، فن کی عظمت کے ساتھ ان کی ہر دل عزیزی میں ان کی اس شخصیت کا بڑا دخل ہے جسے پہلے پہل حالیؔ نے دریافت کیا تھا اور یوں کہ ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

حسن بھی جلوہ گر تھا اور زندگی کے نشیب و فراز بھی نظر آتے تھے، یوں پیش کی کر لوگوں کے دلوں میں اتر تی چلی گئی انھوں نے بتایا کہ انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ پلڑا کس طرف جھکتا ہے اور یقیناً غالبؔ کی خوبیوں کا پلڑا بہت جھکا ہوا ہے۔

اگر ہم خود حالؔی کی سیرت اور شخصیت پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ انھوں نے غالبؔ کی جو صفات دکھائی ہیں، وہ خود ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ شوخیِ گفتار۔ اگرچہ لے دھیمی ہے۔ اخلاق کی بلندی۔ جس پر مجھے کہنے دیجیے کہ آج تک کوئی شاعر نہیں پہنچا۔ خودداری کہ زندگی میں کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ قناعت کہ روکھی سوکھی پر بسر کی۔ سخاوت کہ فقیری میں شاہی کی اور یوں کہ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے کو خبر نہ ہونے دی۔ خدا پرستی، مذہب سے شیفتگی ایسی کہ باطن کے نور سے سینہ روشن اور ظاہری احکام و فرائض سے چہرہ منور! عقیدہ یہ کہ ؎

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عشرت کی ولا ہے

دوسرے کی ان ہی صفات کی انسان سچی قدر کر سکتا ہے جن کی خود اس کے دل میں عظمت ہو اور جو خود اس کی ذات میں موجود ہوں۔ انھوں نے اپنے محترم استاد، محبوب دوست مرزا غالبؔ میں ان صفات کا جلوہ دیکھا تھا، ان کی قدر کی تھی، ان سے متاثر ہوئے تھے۔ اور ان کا یہی مقصد تھا کہ اصلی غالبؔ سے دنیا متعارف ہو۔ آج مداح کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں مگر ان کے محبوب کا رخِ روشن تابناک سے تابناک تر ہوتا جاتا ہے۔ اور اس چہرے کو دیکھیے جو دوسرا چہرہ ہے، وہ کم روشن اور تابناک نہیں۔

پھر میں کہوں گی کہ غالبؔ کا شاعرانہ کمال، فن کی عظمت کے ساتھ ان کی ہر دل عزیزی میں ان کی اس شخصیت کا بڑا دخل ہے جسے پہلے پہل حالؔی نے دریافت کیا تھا اور یوں کہ ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا